قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ہفتہ وار طلوع اسلام کراچی

جلد نمبر ۸ شمارہ نمبر ۵ — ہفتہ ۵ مارچ ۱۹۵۵ء — قیمت چا[ر آنے] سالانہ دس

قران نے کیا کہا

مریض نے ڈاکٹر سے نسخہ لیا جس میں بہت سی دوائیاں شامل تھیں۔ اس نے نسخہ
والے سے کہا کہ اس میں یہ دوائی مت ڈالو، اس کا ذائقہ کڑوا ہے۔ یہ بھی نہ ڈالو، اسکی بو
پسند نہیں۔ اسے بھی نہ ڈالنا، اسکی قیمت زیادہ ہے۔ اس طرح اس نسخہ سے آدھی دوائیاں اپنی
سے کاٹ ڈالیں اور باقی نسخہ بنوا کر استعمال کرنا شروع کردیا۔ اس سے مرض کو آرام ہونا تو
طرف کئی ایک نئی شکایتیں پیدا ہوگئیں۔ ایسا ہونا ہی چاہئے تھا۔

قران ایک نسخہ ہے نوع انسانی کے امراض کے لئے۔ لیکن اس کا فائدہ اسی صورت
ہوسکتا ہے کہ آپ پورے کے پورے نسخے کو استعمال کریں۔ یہ نہیں کہ جو حکم مفید نظر
اسے مان لیا۔ جو اپنے رجحان طبع کے خلاف ہوا اسے چھوڑ دیا۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اسے
کی زبان سے سنئے۔ افتومنون ببعض الکتاب و تکفرون ببعض فما جزاء من یفعل ذالک منکم الا
فی الحیوۃ الدنیا و یوم القیمۃ یردون الیٰ اشد العذاب (۲/۸۵) کیا تم اس کتاب کے ایک حصے
مانتے ہو اور ایک حصے سے انکار کرتے ہو؟ جو شخص تم میں سے ایسا کریگا اس کی سزا اس
سوا کچھ نہیں کہ وہ دنیا کی زندگی میں بھی ذلیل اور رسوا ہوگا اور قیامت کے دن سخت ع
کی طرف لے جایا جائیگا۔

طلوع اسلام کا مسلک اور مقصد

ہمارا مسلک یہ ہے کہ

۱. تنہا انسانی عقل زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے کافی نہیں۔ اسے اپنی راہنمائی کے لئے اس امر کی ضرورت ہے جس طرح کا [illegible]

۲. یہ وحی اب آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ اس لئے نوع انسانی شرف [illegible] منزل مقصود تک پہنچ سکتی۔

۳. حق و باطل کا معیار قرآن ہے۔ جو روایت قرآن کے خلاف ہو [illegible] خلاف ہے غلط ہے۔

۴. [illegible]

۵. قرآن کی رو سے دنیا میں بسنے والے تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ اس برادری کے قیام کی شکل یہ ہے کہ تمام دنیا ایک نظام کے مطابق زندگی بسر کرے۔

۶. اس نظام کو نظامِ زندگی کی شکل کی صورت یہ ہے کہ ہر زمانے کے انسان اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے جزئی قوانین خود مرتب کریں۔ [illegible] جزئی قوانین حالات کے تقاضے سے بدلتے رہیں گے لیکن قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔

۷. اس نظام کی رو سے قرآن ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہو جاتی ہے اور کوئی فرد و معاشرہ اپنی ضروریات زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ اسے ربوبیت عامہ یعنی تمام نوع انسانی کی پرورش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۸. ربوبیت عامہ کے مقصد عظیم کے حصول کے لئے قرآن کی رو سے ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت کے بجائے معاشرے کی تحویل میں رہیں تاکہ رزق کی تقسیم ہر ایک کی ضرورت کے مطابق ہو [illegible] کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے۔ اسے قرآنی نظامِ ربوبیت کہا جاتا ہے۔

ہمارا مقصد یہ ہے کہ

[illegible]

اگر آپ طلوع اسلام کے اس مسلک اور مقصد سے متفق ہیں تو اس پیغام کو عام کرنے میں طلوع اسلام کا ساتھ دیجئے

اس شمارے میں

- جمہوریت اور اسلام
- مجرم کون ہے؟
- عالم اسلامی
- مشرقی پاکستا[ن]
- مغربی پاکستان
- تاریخی شواھد
- اسلام کی سرگزشت
- مجلس اقبال
- عورت کا قران
- مرد درویش
- متحدہ محاذ کی کشمکش
- بین الاقوامی جا[ئزہ]
- حقائق و عبر
- اندرون ہند
- باب المراسلات
- نقد و نظر

As. -/4/-

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ
(اقبال)

شناسِ رسولؐ مزاج

جماعتِ اسلامی کی خطرناک ڈکٹیٹر شپ پر
طلوعِ اسلام کا بے لاگ تبصرہ

شائع کردہ
ادارہ طلوعِ اسلام - کراچی

ضخامت ۴۴۸ صفحات - مجلد مع گرد پوش -
قیمت -/۴ روپے علاوہ محصول ڈاک

اسلامی نظام

قیمت -/۲ روپے

اسبابِ زوالِ امت

قیمت -/۱/۸ روپیہ

بچوں، عورتوں، کم پڑھے لکھے لوگوں اور سرکاری ملازموں کیلئے

اسلامی معاشرت

جس میں آسان زبان میں بتایا گیا ہے کہ اسلام کسے کہتے ہیں
اور قرآن کی رُو سے مسلمانوں کا معاشرہ کس قسم کا ہونا چاہیئے

پرویز

شائع کردہ
ادارہ طلوعِ اسلام - کراچی

ضخامت ۱۹۲ صفحات مجلد مع گرد پوش
قیمت -/۲ روپے علاوہ محصول ڈاک

دورِ حاضر کی ایک عجیب و غریب کتاب
ہماری بصیرت کے مطابق

قرآنی فیصلے

ایسے متعدد امور کے متعلق ← جنہیں
سمجھا کچھ اور جاتا ہے — اور وہ ہیں کچھ اور

شائع کردہ - ادارہ طلوعِ اسلام کراچی

ضخامت ۴۰۸ صفحات مجلد مع گرد پوش
قیمت -/۴ روپے علاوہ محصول ڈاک

ہفتہ وار

طلوع اسلام

جلد ۸ | ۵ مارچ ۱۹۵۵ء | نمبر ۵

جمہوریت اور اسلام

سابقہ اشاعت میں بتایا جا چکا ہے کہ پاکستان کے موجودہ حالات کے پیش نظر ہمارے ہاں کس قسم کی جمہوری مشینری موزوں ہو سکتی ہے۔ اب یہ دیکھئے کہ قرآن کی رُو سے جمہوریت کے نظریہ کی صحیح پوزیشن کیا ہے۔

نظریۂ جمہوریت کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ معاشرہ میں فرد کی حیثیت حقیقی ہے اور نظام کا قیام فرد کی خاطر ہوتا ہے۔ اور فرد کی یہ حیثیت محض انسان ہونے کی جہت سے ہے۔ باقی دنیا کو شاید اس کا علم نہ ہو لیکن قرآن جاننے والے کو یہ معلوم ہوگا کہ اس حقیقت کبریٰ کا اعلان سب سے پہلے قرآن نے کیا کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) ہم نے فرزند آدم کو واجب التکریم بنایا ہے۔ یعنی ہر انسان، محض اپنے انسان ہونے کی بنا پر تعظیم و تکریم کا مستحق ہے۔ اس کی اضافی حیثیتیں (RELATIVE POSITIONS) سب بعد میں آتی ہیں۔ اس کی اصلی اور حقیقی پوزیشن "ابن آدم" ہوتا ہے۔ قرآن کے اس اعلان کی رُو سے نوع انسانی کا ہر فرد واجب التکریم ہے اور جو نظام اس کی پوزیشن کا احترام نہیں کرتا وہ کافرانہ طاغوتی نظام ہے۔ اس سے آگے بڑھئے تو ہمیں نظر آتا ہے کہ قرآن نے ہر فرد کو الگ تشخص (PERSONALITY) عطا کی ہے۔ یہی وہ الگ تشخص ہے جس کی بنا پر وہ ہر فرد کو اس کے اعمال کا ذمہ دار ٹھہراتا اور ان کے نتائج کا مستحق قرار دیتا ہے اس کا اعلان ہے کہ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا (۶/۱۰۴) جو آنکھیں کھول کر چلے گا تو اس کا فائدہ خود اس کی اپنی ذات ہی کو ہوگا اور جو آنکھیں بند رکھے گا تو اس کا وبال بھی اسی پر پڑے گا۔ یہاں کا قانون یہ ہے کہ ہر فرد اپنا اپنا بوجھ آپ اُٹھائے۔ کسی کو اس کی اجازت نہیں ہے کہ اپنا بوجھ کسی دوسرے کی پیٹھ پر لادے۔ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (۵۳/۳۸) اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ نظریۂ جمہوریت کا بنیادی اصول قرآن ہی کی تعلیم پر مبنی ہے۔

اس نظریہ کا دوسرا اصول یہ ہے کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ جہاں تک اس نظریہ کے اتنے حصے کا تعلق ہے یہ بھی قرآن کی تعلیم کے عین مطابق ہے۔ عام انسان تو ایک طرف اس کا اعلان یہ ہے کہ کسی نبی کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کو اپنے احکام کا غلام بنائے۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ ..... (۳/۷۹) کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ خدا اُسے کتاب اور حکومت اور نبوت عطا کرے اور وہ لوگوں سے یہ کہنا شروع کر دے کہ تم میرے (احکام کے) غلام بن جاؤ۔

نظریۂ جمہوریت نے اس تصور سے (کہ کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا حق حاصل نہیں) یہ اصول وضع کیا کہ انسانوں کو خود یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے لئے آپ قوانین مرتب کریں اور پھر ان قوانین کی اطاعت کریں۔ اس کا نام جمہوری نظام ہے۔ قرآن اس اصول سے اختلاف کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب ہم نے یہ کہا ہے کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں کو کسی ایسے آئین کی اطاعت کرنی چاہیئے جو ان کا خود ساختہ نہ ہو اور جو تمام انسانوں پر اسی طرح یکساں طور پر حاوی ہو جس طرح فطرت کے طبعی قوانین سب پر یکساں حیثیت سے حاوی ہیں۔ فطرت کا یہ طبعی قانون کہ فطرت کا مدار سانس پر ہے، ایک بادشاہ پر بھی اسی طرح حاوی ہے جس طرح اس کے ایک ادنیٰ غلام پر۔ اگر انسانوں کو اختیار ہوتا کہ وہ زندگی کے متعلق طبعی قانون خود مرتب کر لیں تو یقیناً مختلف طبقوں کے لئے مختلف قوانین بنا کرتے۔ سو جس طرح انسانوں کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی طبعی زندگی کے لئے خود قوانین وضع کریں، اسی طرح انہیں یہ بھی حق حاصل نہیں کہ اپنی تمدنی اور معاشی زندگی کے لئے خود قوانین وضع کریں۔ انہیں جس مقام سے ان کی طبعی زندگی کے لئے قوانین ملے ہیں وہیں سے ان کی اجتماعی زندگی کے لئے بھی قوانین ملیں گے۔ بالفاظ دیگر یہ قوانین خدا کی طرف سے ملیں گے (اس کو وحی کی راہ نمائی کہتے ہیں)۔ یہ قوانین فطرت کے طبعی قوانین کی طرح غیر متبدل ہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے خود مغرب کے مفکرین بھی تسلیم کر رہے ہیں۔ چنانچہ مشہور اطالوی مدبر میزینی (MAZZINI) جمہوری نظام پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے،

> اس میں شبہ نہیں کہ عام رائے دہندگی کا اصول بہت اچھی چیز ہے۔ یہی وہ قانونی طریق کار ہے جس سے ایک قوم تباہی کے مسلسل خطرات سے محفوظ رہ کر اپنی حکومت آپ قائم رکھ سکتی ہے۔ لیکن ایک ایسی قوم میں جس میں وحدتِ عقائد نہ ہو، جمہوریت اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہے کہ وہ اکثریت کے مفاد کی نمائندگی کرے اور اقلیت کو مغلوب رکھے۔ ہم یا تو خدا کے بندے بن سکتے ہیں یا انسان کے۔ وہ ایک انسان ہو (ملوکیت) یا زیادہ (جمہوریت) بات ایک ہی ہے۔ اگر انسانوں کے اوپر کوئی اقتدار اعلیٰ نہ ہو تو پھر کونسی چیز ایسی رہ جاتی ہے جو ہمیں طاقتور افراد کے تغلب سے محفوظ رکھ سکے؟ اگر... ہمارے پاس کوئی ایسا مقدس اور ناقابل تغیر قانون نہ ہو جو انسانوں کا وضع کردہ نہ ہو، تو ہمارے پاس وہ کونسی میزان رہ جاتی ہے جس سے ہم یہ پرکھ سکیں کہ فلاں کام یا فیصلہ عدل پر مبنی ہے یا نہیں۔ خدا کے علاوہ جو بھی حکومت قائم ہو اس میں نتائج کی حقیقت ایک ہی رہتی ہے خواہ اس کا نام بوناپارٹ رکھ لیں یا انقلاب (REVOLUTION) اگر خدا درمیان میں نہ ہو تو اپنے زمانہ سطوت میں ہر ایک مستبد بن جائے گا۔ ..... یاد رکھئے کہ جب تک کوئی حکومت خدا کے قوانین کے مطابق نہیں چلتی اس کا کوئی حق مسلّم نہیں۔ حکومت تو منشائے خداوندی کی ترویج و تنفیذ کے لئے ہے۔ اگر وہ اپنے اس فریضہ کی سرانجام دہی میں قاصر ہے تو تمہارا یہ حق ہی نہیں بلکہ فریضہ ہے کہ ایسی حکومت کو بدل ڈالو۔

لیکن آپ قوانین فطرت پر غور کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ قوانین صرف اصولی حیثیت سے مرتب ہوئے ہیں۔ ان کی عملی جزئیات، حالات اور ضروریات کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ "زندگی کا مدار ہوا پر ہے" یہ ایک اصولی قانون ہے۔ لیکن یہ تفصیلات کہ ہمیں مکان کس انداز کے بنانے چاہئیں جن میں ہوا کی آمد و رفت کا سلسلہ ٹھیک رہے۔ ہوا خراب ہو جائے تو اس کے صاف کرنے کے لئے کیا کرنا چاہیئے جب مریض کے پھیپھڑے از خود کام کرنے سے جواب دے دیں تو اسے کس طرح آکسیجن دے کر زندہ رکھنا چاہیئے۔ سمندر کی تہ میں تنفس کا انتظام کس طرح کرنا چاہیئے اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر تنفس ہوا کو کس طرح اٹھا کر لے جانا چاہیئے، وغیرہ وغیرہ فطرت کی طرف سے مرتب ہو کر نہیں ملیں۔ ان چیزوں کو ہمیں اپنے اپنے حالات کے مطابق خود مرتب کرنا ہوگا۔ اسی طرح انسانوں کے نظم اجتماعی کے متعلق قوانین بھی اصولی طور پر دیئے گئے ہیں۔ جن کی عملی جزئیات زمانہ کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتی رہیں گی۔ یہ عملی جزئیات ہر زمانہ کے انسان اپنے لئے آپ مرتب کریں گے۔ ان کیلئے

قرآن نے کہا ہے کہ یہ باتیں باہمی مشورہ سے طے کرنی چاہئیں۔ ان دونوں چیزوں کو سامنے رکھنے سے قرآن کے یہ دونوں اصول سمجھ میں آ جائیں گے جن میں اس نے ایک طرف یہ کہا ہے کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۔ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ (۱۲/۴۰) حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا اور کسی کی محکومیت اختیار نہ کرو۔ اور دوسری طرف کہا ہے کہ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے پائیں گے۔ یعنی خدا کے متعین کردہ اصولوں کی روشنی میں (جو قرآن کے اندر ہیں) عملی جزئیات باہمی مشاورت سے طے پائیں گے۔ بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ انسانوں کو صرف اس کا حق ہے کہ وہ دین کے اصولوں کی روشنی میں شریعت کی جزئیات مرتب کرتے رہیں۔ دین سازی کا حق کسی انسان یا انسانوں کی کسی جماعت (پارلیمان وغیرہ) کو حاصل نہیں حتیٰ کہ رسول کو بھی نہیں۔ چنانچہ سورۂ آل عمران کی وہ آیت جس کا ایک حصہ اوپر دیا جا چکا ہے۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (۳/۷۸)۔ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ خدا اسے کتاب و حکومت و نبوت عطا کرے۔ اور وہ لوگوں سے یہ کہنا شروع کر دے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میری محکومی اختیار کرو۔ اسے یہی کہنا چاہیئے کہ تم سب اس کتاب کی اطاعت سے جسے تم پڑھتے پڑھاتے رہتے ہو خدا کی ربوبیت کے حامل بن جاؤ۔

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ قرآن، عصر حاضر کے نظریۂ جمہوریت کی اس شق کی یکسر مخالفت کرتا ہے کہ انسانوں کو قانون سازی کا اقتدارِ کُلّی حاصل ہے۔ ان کا یہ اختیار و اقتدار، دین کے غیر متبدل اصولوں کی حدود کے اندر جزئیات مرتب کرنے تک محدود ہے۔ لیکن وہ اس نظریہ کی اس شق کی تائید کرتا ہے کہ یہ جزئیات باہمی مشاورت سے مرتب کرنی چاہئیں۔

باہمی مشاورت کے لئے مشینری کس قسم کی نصب کرنی چاہیئے، اس کے لئے قرآن نے کوئی غیر متبدل قاعدہ نہیں تجویز کیا۔ اس لئے کہ یہ وہ چیز ہے جو لوگوں کی ذہنی سطح، ان کے سیاسی شعور اور زمانہ کے حالات کے ساتھ ساتھ بدلتی رہے گی۔ یہ وہ حقیقت تھی جو ملت اسلامیہ کے السابقون الاوّلون (رضی اللہ عنہم) کے اچھی طرح پیش نظر تھی۔ حکومت کے معاملات میں سب سے اہم سوال صدر مملکت (امیر المومنین) کے انتخاب کا ہے۔ اس باب میں بھی دیکھئے کہ ان حضرات نے کسی خاص نہج اور خاص شکل کی پیروی ضروری نہیں سمجھی۔ رسول اللہ نے اپنے جانشین کے لئے کوئی ہدایات نہیں دیں۔ آپ نے اسے اُمّت کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔ حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب اعیانِ مدینہ نے کیا (پوری اُمّت کی مشاورت کو اس کے لئے ضروری نہیں سمجھا گیا ویسے بھی یہ چیز اس زمانے کے حالات کی رُو سے ناممکن العمل تھی) حضرت عمرؓ کو خود حضرت ابوبکرؓ نے نامزد کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے بعد خلیفہ کے انتخاب کے لئے اعیانِ مدینہ سے پانچ ارکان کی ایک کمیٹی مقرر کر دی۔ حضرت علیؓ ان سب سے الگ حالات میں سریر آرائے خلافت ہوئے۔ انتخاب خلیفہ کے بعد دیگر امورِ مملکت کو دیکھئے۔ ان میں بھی موجودہ زمانہ کی جمہوری مشینری کی اتباع نہیں کی گئی۔ نہ ووٹوں کے ذریعہ کسی پارلیمان کا انتخاب ہوا، نہ پارلیمان کی کثرت رائے سے معاملات کے فیصلے ہوئے۔ ایسا بھی ہوا کہ اکثریت کے فیصلے کو ترجیح دی گئی۔ اور ایسا بھی ہوا کہ امیر المومنین نے اکثریت کے فیصلے کے خلاف، تنہا اپنی صوابدید کے مطابق عمل کیا۔ فیصلہ کرنے کے طریقوں میں اختلاف رہا لیکن روح ہر جگہ ایک ہی کارفرما رہی اور وہ یہ کہ کوئی فیصلہ قرآن کے کسی اصول سے نہ ٹکرائے اور اُمّت کی بہبودِ کُلّی اور افراد سے متعلق عدلِ عمرانی سے متصادم نہ ہو۔ یعنی جمہوریت کی روح تو ہر جگہ کارفرما رہی لیکن جمہوری مشینری کی سختی سے پابندی رکھی نہیں کی گئی۔ کہا جا سکتا ہے کہ جب کسی صدر مملکت (امیر المومنین) نے کوئی فیصلہ مجلس مشاورت کی اکثریت کے خلاف، خود اپنی رائے کے مطابق کیا تو یہ شخصی استبداد یا آمریت، (ڈکٹیٹر شپ) ہو گیا۔ لیکن یہ خیال واقعات کے عدم علم پر مبنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ فیصلے کبھی شخصی استبداد و آمریت کے مظہر نہیں بن پاتے تھے۔ اس لئے کہ اوّل تو وہ ہمیشہ دین کے غیر متبدل قوانین کے حدود میں گھرے ہوتے تھے اور دوسرے یہ کہ اُمّت کو یہ اختیار ہر وقت حاصل تھا کہ وہ صدر مملکت کو برطرف کر کے اس کی جگہ دوسرا خلیفہ منتخب کرے۔ اُس دور میں اُمّت نے اپنے اس اختیار کو برتا نہیں۔ اس لئے کہ اس کے برتنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ لیکن اس کے باوجود یہ اختیار ہر وقت موجود تھا اور ہر خلیفہ، اپنے اولیں خطبۂ خلافت میں اُمّت کے اس اختیار کا اعلان کرتا تھا۔ اُمّت کے اس اختیار اور قانون سازی کی اس تحدید کے ساتھ (جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے) خلیفہ کا تنہا اپنی رائے کے مطابق فیصلہ بھی جمہوریت کی صحیح روح کا آئینہ دار ہوتا تھا۔ یہ سمجھ لینا کہ کسی مجلس مشاورت کی اکثریت کا فیصلہ بہر حال صحیح ہوتا ہے، اس لئے اسے حرفِ آخر سمجھنا چاہیئے، ایسا بدیہی طور پر غلط ہے کہ اب نظام جمہوری کے بلند ترین علمبرداروں نے بھی اس کی غلطی کو محسوس کر کے اس کا اعتراف کر لیا ہے۔ ۱۹۴۸ء میں اقوام متحدہ کی ثقافتی مجلس (UNESCO) نے ایک تحقیقاتی کمیٹی اس مقصد کے لئے مقرر کی تھی کہ وہ جمہوری اندازِ حکومت کے متعلق سائنٹفک طریق سے چھان بین کرے۔ اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں (علاوہ دیگر امور) یہ بھی لکھا تھا کہ "یہ سمجھنا غلط ہے کہ اکثریت کا فیصلہ غلطی سے پاک ہوتا ہے۔ وہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے اقلیت کو حق حاصل ہونا ہے کہ وہ اکثریت کے فیصلے کے خلاف ایجی ٹیشن کرے اور اسے بدلوا دے"۔ اور روسو نے (جو موجودہ نظام جمہوریت کا امام ہے) تو یہاں تک بھی کہہ دیا تھا کہ "جن اقوام میں حکومت نیک نہاد ہوگی وہاں اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی (کہ ساری قوم کو اکٹھا کر کے فیصلے کرائے جائیں) اس لئے کہ وہاں ارباب حکومت اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ "اجتماعی ارادہ" کا وہی فیصلہ ہوگا جس سے مفاد عامہ حاصل ہو"۔

تصریحات بالا سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آ گئی ہوگی کہ اسلامی جمہوریت کے یہ معنی نہیں کہ جمہوری نظام کی کسی خاص مشینری کو غیر متبدل سمجھ کر اس کی شدت اور سختی سے پابندی کی جائے۔ اگر اس جمہوریت کی روح سامنے رہے جو قرآن سے متعین ہوتی ہے اور کوئی قدم ایسا نہ اٹھایا جائے جو اس کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہو تو اپنے اپنے حالات کے ماتحت جمہوری مشینری میں رد و بدل کیا جا سکتا ہے۔ اس حد تک بھی کہ بعض حالات کے ماتحت، کثرت رائے کو بھی قول فیصل نہ سمجھا جائے اور عند الضرورت صدر مملکت اپنی صوابدید کے مطابق اپنی مجلس مشاورت کا انتخاب بھی آپ کر سکے۔

غواص کو مطلب ہے گہر سے نہ صدف سے

مجرم کون ہے؟

"کراچی شہر کی پولیس نے .... نامی ایک تیس سالہ نوجوان کو اقدام خودکشی کے جرم میں گرفتار کیا ہے۔
کہا جاتا ہے کہ ...... کئی ماہ سے بیکار تھا اور شہر میں اس کے رہنے کے لئے کوئی جگہ بھی نہ تھی۔ جب وہ حصول معاش کی کوششوں میں ناکام ہو گیا تو اس نے مایوس ہو کر پیٹ میں چھرا گھونپ لیا اور سٹیٹ بینک کی دیوار کے ساتھ ٹکر مار کر مر جانے کی کوشش کی۔ پولیس نے اسے گرفتار کر کے ہسپتال بھیج دیا جہاں اس کی حالت بہتر بتائی جاتی ہے"۔　　　(ٹائمز آف کراچی ۲۵/۲/۵۵)

یہ خبر اخبار کی ہے اور نہ ہی یہ واقعہ غیر معمولی ہے۔ قریب قریب ہر روز اور ہر شہر میں اس قسم کے واقعات ہوتے اور اس قسم کی خبریں چھپتی رہتی ہیں۔ لیکن ہم نے جس مقصد کے لئے اسے شائع کیا ہے وہ کچھ اور ہے۔ یہ درست ہے کہ خودکشی جرم ہے اور جو اس جرم کا ارتکاب کرتا ہے، پولیس کا فریضہ ہے کہ اُسے گرفتار کرے اور اس پر مقدمہ چلائے اور عدالت کا فریضہ ہے کہ جرم ثابت ہونے کی صورت میں اسے سزا دے کر جیل خانے بھیج دے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جس وقت یہ نوجوان شہر میں مارا مارا پھرتا تھا کہ اسے کہیں روزگار مل جائے اور اسے روزگار نہیں ملتا تھا۔ جس وقت وہ سارے دن کی دوڑ دھوپ کے باوجود، بھوکے پیٹ، کوئی چھت تلاش کرتا تھا کہ جس کے نیچے وہ رات بسر کر سکے۔ اور اسے چھت نہیں ملتی تھی، تو کیا اُس وقت بھی کسی کا فریضہ تھا یا نہیں کہ اس کے لئے روزگار مہیا کرے۔ روزگار نہیں ملتا تو اس کے کھانے کے لئے روٹی اور رہنے کے لئے مکان کا انتظام کرے؟ اُس وقت اس جو دو پندرہ لاکھ کی بھری بستی میں اُس کی مصیبت تنہا اُس کی مصیبت اور اس کی پریشانی تنہا اُس کی پریشانی تھی۔ اُس وقت کسی کا فریضہ نہیں تھا کہ اس کی مصیبت میں اُس کا ہاتھ بٹائے اور اس کی پریشانی میں اس کا ساتھ دے۔ لیکن جب اس نے تنگ آ کر ٹکر ماری، تو اس سے بہت سے فرائض بیدار ہو گئے! یہ ٹھیک ہے کہ اقدام خودکشی جرم ہے لیکن (مذکورہ صدر حالات میں) خودکشی کرنے والا اس جرم کا اتنا ذمہ دار نہیں جتنا ذمہ دار وہ معاشرہ ہے جو اسے اس اقدام پر مجبور کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فطرت کے اٹل قوانین (جو عدل کی

صحیح بنیادوں پر قائم ہیں) اس فرد کو نہیں بلکہ پورے معاشرے کو سزا کا مستوجب قرار دیتے ہیں ۔ اور جب وہ معاشرہ پوچھتا ہے کہ ہمیں کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے تو اُن سے کہا جاتا ہے اس جرم کی کہ کَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ (۸۹/۱۷) ۔ جو فرد تمہارے معاشرہ میں تنہا رہ جاتا تھا تم اس کی عزت نہیں کرتے تھے ۔ وہ بھوکا ہوتا تھا تو تم اس کے کھانے کا انتظام نہیں کرتے تھے اِطْعَامٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ (۹۰/۱۴) اس فرد کے کھانے کا جو تم سے اتنا قریب ہونے کے باوجود اپنے آپ کو تنہا پاتا تھا يَتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ (۹۰/۱۵) یا اس گرد آلود، خاک نشین محتاج کا جسے کاروبار کے لئے کوئی راستہ نہیں ملتا تھا ۔ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۔ (۹۰/۱۶)

اور آپ کو معلوم ہے کہ فطرت کی عدالت سے اس جرم کی سزا کیا ملا کرتی ہے؟ وہ ان تمام خوش حالیوں کو چھین لیا کرتی ہے جو اُس نے عطا کر رکھی ہوں ۔ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ (۵۶/۶۷) اور آسمان کی بلندیوں پر اُڑنے والوں کو زمین کی پستیوں میں دھکیل دیا کرتی ہے ۔ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا (۱۱/۸۲)

حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

بزمِ طلوعِ اسلام

مردان جو بزم ہائے طلوعِ اسلام جگہ بہ جگہ معرضِ وجود میں آچکی ہیں ان میں مردان کی بزم بڑی سرگرم اور مستعد ہے ۔ معاصر "نوائے وقت" لاہور کی ۱۹ رفروری کی اشاعت میں اس بزم سے متعلق جو اطلاع اس کے نامہ نگار کی وساطت سے چھپی ہے وہ قارئین کی دلچسپی کے لئے ذیل میں درج کی جاتی ہے ۔

یہاں بزمِ طلوعِ اسلام کو بڑی مقبولیت حاصل ہو رہی ہے اور اس کے ہم نواؤں کے حلقہ میں روز بروز توسیع ہو رہی ہے جہاں عوام کی اکثریت نے بزم کی سرگرمیوں کو پسند کیا ہے ۔ وہاں جماعتِ اسلامی کی نظر میں بزم کی سرگرمیاں کھٹکنے لگ گئی ہیں ۔ حال ہی میں جماعت کے زیرِ اہتمام رستم، تخت بھائی اور مردان میں جلسے منعقد کئے گئے جن میں پاکستان کی قیادت کو کوسا گیا اور بزمِ طلوعِ اسلام کے پروگرام پر بھی نکتہ چینی کی گئی عوام کی رائے یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی کی ساکھ ختم ہو چکی ہے اس لئے وہ نعروں کا سہارا لے کر دوبارہ مقبول ہونے کی ناکام کوششیں کر رہی ہے ۔ لیکن عوام اب اس جماعت کے بھرے میں آنے کے نہیں ۔ ڈاکٹر عبدالحکیم خاں اور ان کے رفقاء کی کوششوں سے بزمِ طلوعِ اسلام کو روز افزوں فروغ حاصل ہو رہا ہے اور اس تنظیم کی بدولت عوام میں مذہبی شغف کے ساتھ ساتھ ملکی امور و مسائل میں دلچسپی بھی بڑھ رہی ہے ۔

گجرات گجرات سے محمد حسین حکیم صاحب اطلاع دیتے ہیں کہ وہ بزم کی تشکیل میں کوشاں ہیں اور عنقریب ہفتہ وار اجتماع کا بھی انتظام کریں گے ۔ مقامی قارئین سے التماس ہے کہ وہ آن سے رابطہ پیدا کریں اور بزم کی تشکیل میں ان کا ہاتھ بٹائیں ۔

عالمِ اسلامی

عراق اور ترکی نے بالآخر معاہدہ مرتب کر ہی لیا ۔ یہ معاہدہ شائع کر دیا گیا ہے اور ان دونوں ممالک کی پارلیمانوں نے منظور بھی کر لیا ہے ۔ ابھی پچھلے مہینے میں ترکی اور عراق نے معاہدہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا ۔ اتنی قلیل مدت میں، مخالفت کے علی الرغم، اس کا مرتب ہو کے منظور ہو جانا ایک خوشگوار مستقبل کا پتہ دیتا ہے اور حرکت و عمل و اتحاد کے ایک نئے دور کا آغاز ہے ۔

یہ معاہدہ فی الواقعہ ایک نئے دور کی تمہید ہے ۔ ترکی کے وزیرِ اعظم عدنان مندریز نے پارلیمان میں کہا کہ اب برطانیہ، امریکہ اور ایران کے اس معاہدے میں شریک ہونے کا راستہ صاف ہو گیا ہے ۔ وزیرِ اعظم عراق نوری السعید نے عراقی پارلیمان میں کہا کہ برطانیہ اور امریکہ جلد اس اتحاد میں شریک ہو جائیں گے ۔ انہوں نے اس امید کا بھی اظہار کیا کہ اس کے ساتھ ایران اور پاکستان بھی شریکِ معاہدہ ہو جائیں گے ۔ معاہدہ کی توسیع عراق کے لئے بالخصوص مفید ہو گی ۔ کیونکہ جیسا کہ نوری السعید نے اعلان کیا، جونہی دیگر ممالک شریک ہوں گے، عراق برطانوی عراقی معاہدہ کو ختم کر دے گا ۔ واضح رہے کہ یہ معاہدہ سنہ ۱۹۳۰ء میں طے ہوا تھا اور سنہ ۱۹۳۲ء میں عراق کے آزاد ہونے پر نافذ العمل ہوا تھا ۔ اس کی رو سے برطانیہ کے عراق میں دو ہوائی اڈے قائم ہیں اور اسے عراق سے برطانوی فوجیں گزارنے کا حق بھی حاصل ہے ۔ یہ معاہدہ برطانوی مفاد اور عراقی وطنیت کے مابین مفاہمت تھی ۔ اب اس کے خاتمے کی اطمینان بخش صورت پیدا ہو جائے گی ۔ اس کا تقابل سویز کے متعلق برطانوی مصری تصفیہ سے کیا جا سکتا ہے ۔ وہ کوئی اٹھارہ سال کے بعد ختم ہوا ۔ لیکن بڑی بزرگی اور خون خرابے کے بعد ۔ عراق ایک ہی جست میں اس معاہدہ کو بھی ختم کر دے گا اور دوست اقوام سے معاہدہ دفاع میں بھی منسلک ہو جائے گا ۔

معاہدہ طے پا جانے کے بعد دلچسپ واقعات کے ظہور پذیر ہو جانے کی توقع کی جا سکتی ہے ۔ ایک طرف وہ قوتیں ہیں جو اقوامِ مسلمہ کو باہم متحد و معاہد کر رہی ہیں اور دوسری طرف وہ عناصر ہیں جو بدقسمتی سے "فی سبیل اللہ فساد" پر کمربستہ ہیں ۔ آخر الذکر عناصر کا سرخیل مصر ہے ۔ اس نے اعلان کیا ہے کہ معاہدہ پر دستخط ہو گئے تو وہ عرب لیگ کے معاہدہ تحفظ کو خیرباد کہہ دے گا اور اس کے بجائے، عراق کے بغیر ایک نئی تنظیم قائم کرے گا ۔ گو یہ دیکھنا ہے کہ مصر کہاں تک ان دھمکیوں کو پورا کر سکے گا، کیونکہ دیگر اقوامِ عرب اس کی تائید میں نہیں، لیکن قاہرہ کا اضطراری ردعمل دھمکی کا ہے ۔ ایک سرکاری ترجمان نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ: مصر عراق کو عرب لیگ کے معاہدہ تحفظ سے نکلوا دینے کی کوشش کرے گا ۔ لیکن یہ اندازہ لگا لینا مشکل نہیں کہ مصری مخالفت کا زور شور ختم ہو چکا ہے ۔ اسے زیادہ سے زیادہ سعودی عربیہ اور یمن کی تائید حاصل ہو سکی تھی ۔ لیکن اب یمن کو بھی حقیقتِ حال کا علم ہو گیا معلوم ہوتا ہے ۔ وہاں کے وزیرِ اعظم، سیف الاسلام الحسن نے معاہدہ پر تبصرہ کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ترکی عراقی معاہدہ عرب لیگ کے منشور سے انحراف نہیں کہلا سکتا ۔ گویا اب مصر کو صرف سعودی عرب کی حمایت حاصل ہے ۔ ان حالات میں مصر بے دست و پا سا ہو جاتا ہے اور عین ممکن ہے کہ وہ دکھاوے کے لئے تو عراق کی مذمت کرے لیکن درپردہ ایسی کوششیں کرے جس سے اس کے وقار کو جو صدمہ پہنچ چکا ہے اس کی تلافی ہو سکے ۔ اگر ان دنوں مصر کے حالات تسلی بخش ہوتے اور وہاں اقتدار کی جنگ اتنی شدید نہ ہوتی جتنی اب ہے تو مصر کا وجود وحدتِ عالمِ اسلامی کے مفید ہوتا ۔ اب وہ اندرونی طور پر خود مشکلات میں مبتلا ہے اور بیرونی طور پر وہ دنیائے اسلام کو مبتلائے خلفشار کرنے کی کوششیں کر رہا ہے ۔ وبالِ دیدنا!

اب بھی اس کے رویہ کے بہتر ہونے کا امکان باقی ہے ۔ لبنان کے ممبر پارلیمان، ایملی لبستانی، جو ان دنوں پاکستان آئے ہیں، انہوں نے ایک بیان میں کہا ہے کہ عرب ممالک بمعہ مصر، زیادہ سے زیادہ چار ماہ تک ترکی سے معاہدہ کر لیں گے ۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ لبنان چاہتا ہے کہ ایسا ہو جائے ۔ مزید براں انہوں نے یہ انکشاف کیا کہ قاہرہ میں جو وزرائے اعظم کی کانفرنس ہو چکی ہے، اس میں ترکی اور مغرب سے مدد حاصل کرنے کا اصول تسلیم کر لیا گیا ہے ۔ لبستانی صاحب کے الفاظ میں ۔ "مصر خود جناب عدنان مندریز، وزیرِ اعظم ترکی کو مدعو کرے گا ۔" یہ قیاس حسابی طور پر ٹھیک ہو یا نہ ہو ۔ قرائن و آثار سے ایسا پتہ چلتا ہے کہ مصر کو بالآخر جھکنا پڑے گا ۔ وہ ترکی، پاکستان، عراق (اور ایران) کے عزم کا حریف یقیناً نہیں ہو سکتا ۔

انڈونیشیا کا رویہ اب تک یہ چلا آ رہا ہے کہ وہ مسلمان ملک نہیں بلکہ ایشیائی ملک ہے ۔ چنانچہ اس کی حکمتِ عملی بھی زیادہ تر ہندوستان سے مشابہ رہی ہے ۔ ان حالات میں یہ سن کر حیرت ہوتی ہے کہ اس کے وزیرِ امورِ مذہبی نے اس خیال کا اظہار کیسے کر دیا کہ اپریل میں بنڈونگ کے مقام پر جو ایشیائی افریقی کانفرنس ہو رہی ہے، انڈونیشیا ان میں سے مسلمان نمائندوں کی ایک علیحدہ کانفرنس طلب کرے گا ۔ بنڈونگ کانفرنس کا اور جو کچھ بھی نتیجہ نکلے اسے یقیناً مسلمان ممالک تبادلۂ خیالات کا عمدہ ذریعہ بنا سکتے ہیں ۔ وہ اگر مشترک مسائل میں مشترک پالیسی پر کاربند ہو سکیں تو اس سے عالمِ اسلامی کی سیاست کا رُخ مُڑ جائے گا ۔ اور مسلمان ممالک اتحاد و یک جہتی کی بدولت شرق و مغرب کی کشمکش میں توازن پیدا کرنے والے گروہ کی حیثیت اختیار کر سکیں گے ۔ اور اگر کہیں وہ قرآن کے نظامِ ربوبیت کا کما حقہ شعور پیدا کر کے اس کو رائج و نافذ کرنے کا تہیہ کر لیں تو پھر دنیا کی امامت ان کے حصے میں آ جائے اور زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے ۔ یہ انقلاب ہو تو بڑا انقلاب ہو ۔

شام میں فارس الخوری کی وزارت کے مستعفی ہو جانے کے بعد صابری اصالی نے جو نئی حکومت مرتب کی ہے اسے اعتماد کا ووٹ حاصل ہو گیا ہے ۔ نئی حکومت کے حق میں ۷۶ ووٹ تھے اور خلاف ... ۵۵ ۔ شامی پارلیمان، سال گذشتہ کے آخر میں معرضِ وجود میں آئی تھی اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کسی ایک پارٹی کو بھی اکثریت حاصل نہیں ۔ یہ افسوسناک صورتِ حال ہے کیونکہ اس سے متوازن اور مستحکم حکومت بننے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں اور

(باقی صفحہ ۱ پر)

کوائف پاکستان

مشرقی پاکستان

یوں تو طلبا کی شوریدہ سری کے مظاہرے یہاں وہاں عام طور پر ہوتے رہتے ہیں لیکن مشرقی بنگال خصوصیت سے ایک ایسا علاقہ ہے جہاں کے اسٹوڈنٹ پڑھنے لکھنے سے زیادہ ہنگاموں اور ہڑتالوں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ مشرقی بنگال میں شاید ہی کوئی دن ایسا ہو جب حکومت کو طلباء کی سیاسی سرگرمیوں کو روکنے یا ختم کرنے کے لئے قدم نہ اٹھانا پڑتا ہو اور سیاسی سرگرمیاں بھی اس قسم کی جن کی وجہ سے سیکڑوں طالب علموں کو اپنی تعلیم کا بہترین زمانہ جیل کی کوٹھریوں میں گزارنا پڑتا ہے۔ مشرقی بنگال کے طلباء کی رگ رگ اور نس نس میں ہنگامہ خیز سیاست اس طرح رچ بس گئی ہے کہ انہیں اس کی ہنگامہ خیزیوں اور ہلاکت انگیزیوں سے ایک لمحہ کے لئے بھی دور نہیں رکھا جا سکتا۔ طلبا کو عملی سیاست میں حصہ لینے اور پڑھنا لکھنا چھوڑ کر ہنگاموں اور ہڑتالوں کے لئے مشورہ دینے والوں بلکہ ان کو اس پر مجبور کرنے والوں میں مولوی فضل الحق، مولانا بھاشانی کے نام سرفہرست ہیں۔ طلباء کے سیاست میں سرگرم حصہ لینے کی وجہ سے مشرقی پاکستان کے ہندوؤں اور کمیونسٹوں کو بھی بڑا اچھا موقع ہاتھ آ گیا ہے۔ چنانچہ یہ پاکستان دشمن عناصر ہمیشہ طلباء کے ساتھ ہنگاموں اور فسادوں میں شامل ہو جاتے ہیں اور معمولی معمولی باتوں کا بتنگڑ بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ طلباء تو ہار مان کر میدان سے ہٹ جاتے ہیں مگر شر پسند ہندو اور تخریب پسند کمیونسٹ پورے صوبے کی فضا کو مسموم بنا دیتے ہیں اور حکومت کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں کھڑی کر دیتے اور مشکلات پیدا کر دیتے ہیں۔

۲۱ر فروری ۱۹۵۲ء کو بعض خود غرض لیڈروں کے اکسانے پر بنگلہ زبان کی حمایت میں طلبا نے ایک جلوس نکالا تھا۔ اس وقت نورالامین وزارت برسر اقتدار تھی اس نے اپنی خاص مصلحتوں کی بنا پر جلوس پر گولی چلوا دی جس سے تین طالب علم ہلاک ہو گئے تھے۔ ان ہلاک ہونے والے طالب علموں کو "شہدا" کا خطاب دیا گیا اور ہر سال ان کی یاد میں جلوس نکالنے اور جلسہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اسی زمانہ میں الیکشن کی گہما گہمی شروع ہو گئی اور فضل الحق صاحب وغیرہ نے گولی چلانے والے واقعے کو بڑی رنگ آمیزی کے ساتھ عوام کے سامنے پیش کیا اور اس واقعے کو الیکشن میں اپنی کامیابی کے لئے ایک حربے کے طور پر استعمال کیا۔ چنانچہ فضل الحق کی متحدہ محاذ پارٹی نے اپنے الیکشنی منشور میں ۲۱ فروری کی رعایت سے ۲۱ دفعات رکھیں اور انہوں نے عوام اور طلباء سے وعدہ کیا کہ ۲۱ر فروری کو قومی دن قرار دے کے ہر سال باضابطہ "یوم شہدا" منایا جائے گا۔ چنانچہ متحدہ محاذ نے اقتدار میں آتے ہی ۲۱ر فروری کو "قومی دن" قرار دے دیا اور پورے صوبے میں یہ سرکلر جاری کر دیا۔ کہ ۲۱ر فروری کو "یوم شہدا" منایا جائے۔

متحدہ محاذ کی حکومت اپنی تخریبی اور پاکستان دشمن سرگرمیوں کی وجہ سے ساٹھ دن ہی میں برطرف کر دی گئی اور صوبے میں گورنر راج قائم کر دیا گیا۔ گورنری راج نے ۲۱ر فروری کی تعطیل کو منسوخ قرار دے دیا۔ اور دوسرے روز جلسے اور جلوس کی ممانعت کر دی۔ اس کے ساتھ صوبے کی گورنری حکومت نے اس کی بھی پوری پوری کوشش کی کہ طلباء کو سیاست کی ہنگامہ آرائیوں سے نکال کر تعلیمی سرگرمیوں کی طرف لگایا جائے۔ گورنری حکومت کو اس میں خاص کامیابی ہو رہی تھی کہ متحدہ محاذ کے لیڈروں نے آپس میں لڑنا شروع کر دیا اور اپنے حریفوں کو شکست دینے کے لئے حسب عادت طلباء کو استعمال کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ اس سال ۲۱ر فروری کو جلسے اور جلوس کے کوئی آثار نہیں تھے لیکن انہی مفاد پرست لیڈروں کے ایما سے کچھ لڑکوں نے دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ کے باوجود جلوس نکالنے کی کوشش کی جس سے تقریباً تین سو طالب علموں کی گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ ان میں ۱۹ لڑکیاں بھی ہیں۔ اب حالات معمول پر ہیں۔ طلبا نے اسکولوں اور کالجوں میں حاضریاں دینی شروع کر دی ہیں مگر ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلباء ابھی تک اپنے درجوں سے غیر حاضر ہیں۔ یونیورسٹی کے رجسٹرار نے ۲۰ر فروری کو اعلان کیا ہے کہ وہ طلبا جو ۲۰ر فروری کے بعد بغیر مناسب وجہ بتائے درجوں سے غیر حاضر رہیں گے انہیں پانچ روپے یومیہ کے حساب سے جرمانہ ادا کرنا ہوگا اور اگر انہوں نے ۵ر مارچ تک اپنے اپنے درجوں میں حاضری نہ دی تو ان کے نام یونیورسٹی سے کاٹ دیئے جائیں گے، ان کے وظائف بند کر دیئے جائیں گے اور ان کو ٹرانسفر سارٹیفکیٹ وغیرہ بھی نہیں دیئے جائیں گے۔

خیال ہے کہ یونیورسٹی کی اس تنبیہ کے بعد طلبا اپنے اپنے درجوں میں حاضر ہو جائیں گے۔ لیکن یہ اصل مرض کا علاج نہیں۔ ضرورت ہے کہ طلباء کے قلب و دماغ کی تربیت اس انداز سے کی جائے کہ وہ جذبات میں بہہ جانے کے بجائے معاملات کو ٹھنڈے دل سے سوچنے اور صحیح نتیجہ پر پہنچنے کے عادی ہو جائیں۔ یہ چیز قرآن کی صحیح تعلیم سے ہو سکتی ہے لیکن اس کی توقع کس سے کی جا سکتی ہے؟

مغربی پاکستان

لاہور سے مسٹر مشتاق احمد گورمانی، صدر مغربی پاکستان انتظامی کونسل نے اعلان کیا ہے کہ کونسل نے اپنی رپورٹ مکمل کر کے گورنر جنرل مسٹر غلام محمد کو پیش کر دی ہے۔ یہ رپورٹ مقررہ میعاد سے ایک ماہ پیشتر تیار کر لی گئی ہے۔

کونسل واقعی ایک انتہائی بارگراں سے عہدہ برآ ہوئی ہے۔ مغربی پاکستان میں اس وقت کم و بیش آٹھ صوبائی یا ریاستی مشینریاں مصروف عمل ہیں جن کا معیار و انداز کار ایک سا نہیں۔ کونسل کو انہیں ایک نظم کے تحت ہی نہیں لانا تھا بلکہ ایک ایسا اسلوب وضع کرنا تھا جس کی رو سے نظم و نسق پہلے سے بہتر ہو جائے۔ اسی سلسلے میں مقامی ملازمتوں کو "مغربی پاکستانی" بنانا، نئے صوبوں کی گیارہ کمشنریوں کے حقوق و اختیارات کا تعین اس طرح کرنا کہ مقامی مسائل حتی الوسع مقامی طور پر نپٹائے جا سکیں اور دیگر گوناگوں پیچیدگیوں کو سلجھانا بڑا صبر آزما مرحلہ تھا۔ مقام مسرت ہے کہ یہ مراحل طے ہو گئے ہیں۔ جس سرعت سے یہ کچھ ہوا ہے اس سے ان اطلاعات کی صداقت میں کم شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ مارچ کے وسط تک صوبوں اور ریاستوں کا خاتمہ ہو چکا ہوگا۔ یہ دن پاکستان کے استحکام میں ایک نمایاں حیثیت رکھے گا۔

مغربی پاکستانی صوبہ کام شروع کر دے تو مرکزی حکومت کی توجہ دستور سازی پر مرکوز ہو جائے گی۔ دستور سازی کے دو پہلو ہیں۔ ایک مسودہ آئین اور دوسرا مجوزہ آئین کے مطابق ملک بھر میں انتخابات کرانا۔ انتظامی کونسل کی کارروائی کی طرح مسودہ آئین کا کام بھی بسرعت تمام ہو رہا تھا لیکن دستور سے متعلق مقدمے نے اس میں تاخیر کر دی ہے۔ پچھلے دنوں وزیر اعظم نے کہا تھا کہ دستور کے ابتدائی مراحل تو طے ہو جائیں گے لیکن آخری فیصلہ فیڈرل کورٹ کے فیصلہ کے بعد ہوگا۔ (طلوع اسلام۔ ۱۹ر فروری ۱۹۵۵ء) مسٹر سہروردی وزیر قانون نے ۲۲ر فروری کو لاہور میں بیان دیتے ہوئے کہا کہ دستور مکمل کر لیا گیا ہے لیکن اس کا نفاذ عدالت کے فیصلے کے بعد ہوگا۔ اس دستور میں مغربی پاکستان کو ایک صوبہ تصور کیا گیا ہے۔ جیسا کہ طلوع اسلام میں بارہا تصریح کی جا چکی ہے، قرآنی آئین کا شعور نہ ان نام نہاد دستور سازوں میں پایا جاتا تھا جنہیں گورنر جنرل نے اکتوبر میں الگ کر دیا اور نہ اس کے آثار نئے قائدین ملک میں دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن سیاسی اعتبار سے پاکستان کو متحد و مستحکم کرنے کی یہی صورت ہے کہ مغرب میں باقی حد بندیاں ختم کر دی جائیں اور مشرق و مغرب کے دونوں صوبوں کو ایک توافقی Confederation میں منسلک کر دیا جائے۔ مجوزہ آئین میں انہی تقاضوں کی رعایت رکھی گئی ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ مجلس دستور ساز بقید حیات تھی تو اس نے سات سال تک ملک کو دستور سے محروم رکھا اور اب گورنر جنرل نے اسے ختم کر دیا ہے تو بھی یہ راستے میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ اس وقت ملک میں جو سیاسی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں اس کی وجہ یہی تاخیر ہے۔ اگر پاکستان کا آئین سال دو سال کے اندر مرتب ہو جاتا تو تشتت و افتراق کی قوتیں کبھی نہ ابھر سکتیں۔

پاکستان اور ہندوستان نے باہمی تنازعات پر غور و خوض کرنے کے لئے جو ہدایت کار کمیٹیاں مقرر کی تھیں، ان کا مشترکہ تمہیدی اجلاس کراچی میں تین دن تک ہوتا رہا۔ ان کا آئندہ اجلاس ۱۱ر مارچ کو دہلی میں ہوگا۔ کراچی کے اجلاس میں جو ڈھائی سو تنازعات زیر غور آئے، انہیں متعلقہ وزارتیں اور شعبے اپنے طور پر زیر بحث لائیں گے۔ مارچ کے آخر میں دونوں ممالک کے وزراء کے مابین سلسلۂ مذاکرات شروع ہونے کی توقع ہے۔ وزرائے اعظم کی ملاقاتیں ۲۸ر مارچ کو دہلی میں شروع ہوں گی۔ ان ملاقاتوں میں اہم ترین سوال کشمیر کا ہوگا۔ لیکن کیا کشمیر کا تصفیہ ہو سکے گا؟ اس کا جواب ہندوستان کے رویہ پر منحصر ہے جب تک اس کے رویہ میں تبدیلی نہیں ہوتی تصفیہ کی امید مشکل ہے۔ خود وزیر اعظم محمد علی صاحب کشمیر کے بارے میں زیادہ پُر امید نہیں ہیں۔ انہوں نے ۷ر فروری کو کلکتہ میں کہا کہ وہ ہمیشہ رجائیت پسند رہے لیکن انہیں مایوس کر دیا گیا ہے۔ اب ان کی امید اس سازگار فضا سے ہے جو دونوں ممالک کے مابین پیدا ہو چکی ہے۔ بے شک فضا سازگار ہے لیکن ہندوستانی ذہنیت میں تبدیلی کے آثار نظر نہیں آتے۔ گذشتہ دنوں میں اس ذہنیت کے بیشتر شواہد سامنے آئے ہیں لیکن اس کا جدید ترین ثبوت دیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ یوم جمہوریہ ہند کی تقریب پر ڈاکٹر راجندر پرشاد اور پنڈت نہرو نے "مرکزی پختونستان کے صدر" کی مخلصانہ مبارکباد کا پیغام قبول کیا اور اس کا شکریہ ادا کیا۔ یہ عین اس وقت ہوا جب ہمارے گورنر جنرل دہلی میں موجود تھے اور وہ ڈاکٹروں کے مشوروں کے علی الرغم اس لئے دہلی تشریف لے گئے تھے کہ دونوں ممالک کے مابین امن و خیر سگالی کی فضا قائم کریں۔

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید   جو نہیں جانتے وفا کیا ہے؟

تاریخی شواھد

(۵)

چنانچہ حضرت نوحؑ کا جواب اس پر شاہد ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے اس سے غرض نہیں کہ یہ لوگ کیا کیا کام کرتے ہیں۔ میرے اور ان کے درمیان وجہِ جامعیت ایمان ہے اور میں محض تمہاری خاطر مومنین کی جماعت کو دھتکار نہیں سکتا۔ یعنی اس جماعت کو جو اس کا اقرار اور تہیہ کر چکی ہے کہ وہ خود بھی قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے گی اور انہی قوانین کو معاشرہ میں رائج کرے گی۔

قَالَ وَمَا عِلْمِي بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ إِنْ حِسَابُهُمْ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّي لَوْ تَشْعُرُونَ ۝ وَمَا أَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِينَ ۝ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُبِينٌ (۲۶/۱۱۲-۱۱۵)

نوحؑ نے کہا۔ ان کے پیشہ اور کام سے تو مجھ کو کیا بحث؟ ان کا حساب کتاب لینا بس خدا کا کام ہے، کیا خوب ہو جو تم اس کو سمجھو، اور میں یہ تو کرنے سے رہا کہ تمہاری خاطر اس جماعت کو دھتکار دوں۔ میرا مقصد تو یہ ہے کہ تمہیں غلط زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرتا رہوں۔

دراں حالیکہ میں تم سے کچھ مانگتا بھی نہیں ہوں۔

وَيَا قَوْمِ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ وَمَا أَنَا بِطَارِدِ الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّهُمْ مُلَاقُو رَبِّهِمْ وَلَٰكِنِّي أَرَاكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُونَ (۱۱/۲۹)

نوحؑ نے کہا لوگو! یہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں تو اس پر مال و دولت کا تم سے طالب نہیں۔ میری خدمت کی مزدوری جو کچھ ہے صرف اللہ پر ہے اور یہ بھی سمجھ لو کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں (وہ تمہاری نگاہوں میں کتنے ہی ذلیل ہوں مگر) میں ایسا کرنے والا نہیں کہ انھیں دھتکار دوں انھیں بھی اپنے پروردگار سے (ایک دن) ملنا ہے (اور وہ ہم سب کے اعمال کا حساب لینے والا ہے) لیکن میں تمہیں سمجھاؤں تو کس طرح سمجھاؤں؟ میں دیکھتا ہوں کہ تم ایک جماعت ہو (حقیقت سے) بے خبر۔

اگر میں انھیں اس لئے دھتکار دوں کہ ان کے پاس دولت نہیں تو میں اپنے اللہ کے یہاں مجرم ٹھہرایا جاؤں گا۔ کہئے، اس وقت مجھے اللہ کی گرفت سے کون بچا سکتا ہے؟

وَيَا قَوْمِ مَنْ يَنْصُرُنِي مِنَ اللَّهِ إِنْ طَرَدْتُهُمْ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ۝ (۱۱/۳۰)

اے میری قوم کے لوگو مجھے بتلاؤ، اگر میں ان لوگوں کو اپنے پاس سے نکال باہر کروں (اور اللہ کی طرف سے مواخذہ ہو جس کے نزدیک معیارِ قبولیت ایمان و عمل ہے نہ کہ تمہاری گھڑی ہوئی شرافت و رذالت) تو اللہ کے مقابلہ میں کون ہے جو میری مدد کرنے گا؟ (افسوس تم پر) کیا تم غور نہیں کرتے؟

یہ لوگ جو بظاہر تمہیں بے کس و بے بس، مفلس و نادار نظر آتے ہیں تمہیں کیا علم ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں کن نعمتوں اور عظمتوں سے نوازنے والا ہے؟

وَلَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ ۔۔۔۔ إِلَى ۔۔۔۔ إِنِّي إِذًا لَمِنَ الظَّالِمِينَ (۱۱/۳۱)

اور دیکھو، میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ نہ یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں۔ نہ میرا یہ دعویٰ ہے کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ جن لوگوں کو تم حقارت کی نظر سے دیکھتے ہو اللہ انھیں کوئی بھلائی نہیں دیگا (جیسا کہ تمہارا اعتقاد ہے) اللہ ہی بہتر جانتا ہے جو کچھ ان لوگوں کے دلوں میں ہے۔ اگر میں تمہاری خواہش کے مطابق ایسا کہوں، تو جو بھی ایسی بات کہے میں ظالموں میں سے ہوگیا۔

اربابِ استبداد کا جواب! اس کے جواب میں قوم نے کیا کہا؟ وہی جو سرکش و متکبر کیا کرتے ہیں!

قَالُوا يَا نُوحُ قَدْ جَادَلْتَنَا فَأَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ۝ (۱۱/۳۲)

اس پر ان لوگوں نے کہا۔ اے نوح تو نے ہم سے جھگڑا کیا اور بہت جھگڑ چکا۔ (اب ان باتوں کو کچھ بننے والا نہیں) اگر تو سچا ہے تو جس بات کا وعدہ کیا ہے وہ ہمیں لا دکھا۔

یعنی تو جو ہمیں بار بار کہتا ہے کہ ہماری غلط روشِ زندگی کا نتیجہ تباہی و بربادی ہوگا، درآنحالیکہ ہم نہایت خوش حالی اور فارغ البالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، تو تو اس تباہی کو ہمارے سامنے لے آ۔ بات صاف ہو جائے گی۔

اس کے جواب میں حضرت نوحؑ نے کہا:

قَالَ إِنَّمَا يَأْتِيكُمْ بِهِ اللَّهُ إِنْ شَاءَ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ ۔۔۔۔
۔۔۔۔ وَأَنَا بَرِيءٌ مِمَّا تُجْرِمُونَ۔ (۱۱/۳۳-۳۵)۔

نوحؑ نے کہا۔ تباہی اور بربادی خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق آیا کرتی ہے۔ تم اسے روک نہیں سکتے۔ اگر اس قانون کے مطابق تم اس مقام تک پہنچ چکے ہو جہاں تباہی آکر رہتی ہے تو پھر میری نصیحت تمہیں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ تمہارے فیصلے تمہارے نشوونما دینے والے کے قانون کے مطابق ہو کر رہیں گے۔ تمہیں کشاں کشاں اسی کی طرف جانا ہے۔ (حکمِ الٰہی ہوا۔ اے نوح) کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس آدمی نے (یعنی نوحؑ نے) اپنے جی سے یہ بات گھڑ لی ہے؟ تو کہدے۔ اگر میں نے یہ بات گھڑ لی ہے تو میرا جرم مجھ پر۔ اور تم جو جرم کر رہے ہو (اس کی پاداش تمہارے لئے) میں اس کو بری الذمہ ہوں۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ حضرت نوحؑ خود اسی قوم میں سے تھے۔ زندگی ان ہی میں گذاری تھی۔ قوم نے اس سے پیشتر ان سے اس قسم کی باتیں کبھی نہیں سنی تھیں۔ جب انھوں نے اپنی دعوت کی تبلیغ شروع کی تو قوم نے سمجھا (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) پاگل ہو گیا ہے جو اس قسم کی بہکی بہکی باتیں کرنے لگ گیا ہے جو نہ ہماری دیدہ ہیں نہ شنیدہ ہیں۔ انھوں نے کہا۔

إِنْ هُوَ إِلَّا رَجُلٌ بِهِ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوا بِهِ حَتَّىٰ حِينٍ۔ (۲۳/۲۵)

(اس کے سوا کچھ نہیں کہ) یہ پاگل ہو گیا ہے۔ بس (اس کی باتوں پر کان نہ دھرو) کچھ دنوں تک انتظار کر کے دیکھ لو اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔

سورہ قمر میں ہے:

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ فَكَذَّبُوا عَبْدَنَا وَقَالُوا مَجْنُونٌ وَازْدُجِرَ (۵۴/۹)

اس سے قبل قومِ نوحؑ نے بھی تکذیب (رسل) کی تھی پس انھوں نے ہمارے (فرستادہ) بندے کو جھٹلایا۔ اس کو پاگل کہا اور اس کو دھمکی دی۔

تخویف و ترہیب لیکن جب دیکھا کہ اسے جنون نہیں۔ اپنے مشن سے عشق ہے اور وہ پاگلوں کی طرح بے ربط و بلا مقصد باتیں نہیں کرتا۔ بلکہ اس کی ہر جنبش ایک خاص قبلۂ مقصود کی طرف منجر ہوتی ہے تو وہ ان اوچھے ہتھیاروں پر اتر آئے جو قوت کے نشہ کا آخری حربہ ہوتے ہیں۔ انھوں نے کہا۔

قَالُوا لَئِنْ لَمْ تَنْتَهِ يَا نُوحُ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمَرْجُومِينَ۔ (۲۶/۱۱۶)

اے نوح! اگر تم (اپنے مشن سے) باز نہ آؤ گے تو تمہیں سنگسار کر دیا جائے گا۔

یہ دھمکی انفرادی طور پر نہیں تھی بلکہ قبیلہ کے سب سے بڑے سردار کی قیادت میں ایک بڑی سازش کے ماتحت اس کا اعلان ہوا تھا۔

قَالَ نُوحٌ رَبِّ إِنَّهُمْ عَصَوْنِي وَاتَّبَعُوا مَنْ لَمْ يَزِدْهُ مَالُهُ وَوَلَدُهُ إِلَّا خَسَارًا ۔ فَلَمْ يَجِدُوا لَهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَنْصَارًا۔ (۷۱/۲۱-۲۵)

نوحؑ نے کہا کہ اے میرے پروردگار ان لوگوں نے میرا کہنا نہیں مانا اور ایسے شخص کی پیروی کی جس کے مال اور اولاد نے اسے نقصان ہی زیادہ پہنچایا۔ اور انھوں نے بڑی بھاری سازش کی تدبیر کر رکھی ہے۔ یہ لوگوں سے کہتے ہیں کہ تم اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور نہ (بالخصوص) ود کو اور نہ سواع کو اور نہ یغوث کو اور یعوق کو اور نسر کو چھوڑنا اور انھوں نے بہتوں کو (بہکا بہکا کر) گمراہ کر دیا۔ اور (اب تو) ان ظالموں کی ہلاکت کو اور زیادہ کر دے۔ چنانچہ (ان لوگوں کا انجام یہ ہوا کہ) اپنے ان ہی جرائم کی وجہ سے وہ غرق کئے گئے۔ اور جہنم میں داخل کئے گئے۔ اور خدا کے سوا ان کو کوئی بھی حمایتی نہ مل سکا۔

معراجِ انسانیت (از پرویز) پیغمبرِ صاحبِ قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآن کے آئینے میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہبِ عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ حضورؐ سرورِ کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ بڑے سائز کے قریباً نو سو صفحات اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ مضبوط و حسین جلد بمعہ گرد پوش۔ قیمت بیس روپے۔ ناظم ادارہ طلوعِ اسلام پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳ کراچی

اسلام کی سرگذشت

(ہمسایہ اقوام سے عربوں کے روابط)

پچھلی اشاعتوں میں جزیرۃ العرب کی جغرافیائی پوزیشن اور عربوں کے متعلق نسبی معلومات، نیز ان کے اہم ترین قبائل کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ ذیل کی سطور میں دیگر اقوام کے ساتھ عربوں کے ان روابط سے گفتگو کی گئی ہے جو اسلام سے پہلے قائم ہو چکے تھے۔

لوگوں میں مشہور ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں عرب دنیا سے ایک الگ تھلگ قوم تھی جس کا غیر قوموں سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ ایک طرف سے صحرا اور دوسری جانب سے سمندر نے انہیں اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا اور آس پاس کی اقوام سے ان کو بالکل ہی قطع کر دیا تھا۔ ان کے ساتھ ان کا کوئی اتصال نہیں تھا۔ نہ وہ ان سے ادب میں کچھ اکتساب کرتے تھے اور نہ ہی تہذیب میں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ نظریہ بالکل غلط ہے۔ عربوں کے اپنے اردگرد کی قوموں سے مادی اور ادبی روابط استوار تھا۔ اگرچہ اتنا ضرور صحیح ہے کہ یہ روابط اس عہد کی متمدن اقوام کی بہ نسبت کمزور ضرور تھے جس کی وجہ ان کا جغرافیائی محل وقوع اور ان کی اپنی حالت اجتماعیہ ہی ہو سکتی ہے۔

عربوں کے روابط دوسری قوموں کے ساتھ متعدد حیثیتوں سے تھے۔ جن میں سے اہم ترین یہ تھیں:

(۱) تجارت۔

(۲) عربی مدنیتوں کی پیدائش جو فارس اور روم سے متصل تھیں۔

(۳) یہودیت اور نصرانیت کی تبلیغی سرگرمیاں جو جزیرۂ عرب میں غلغلہ انداز تھیں۔ وہ لوگوں کو اپنے ادیان کی طرف دعوت دیتیں اور اپنی تعلیمات کی نشر و اشاعت کرتی تھیں ان سب کے متعلق ہم قدرے بیان کریں گے۔

تجارت

جزیرۂ عرب زمانۂ قدیم سے تجارت کے ایک بڑے راستہ پر واقع تھا۔ عرب کبھی اپنی پیداوار دوسرے ممالک مثلاً شام و مصر کو برآمد کرتے تھے۔ ان پیداواروں میں خوشبودار دھونی کی چیزوں کی کثرت تھی۔ جو جنوب میں اور خصوصیت کے ساتھ ظفار میں پیدا ہوتی تھی۔ اور کبھی دوسرے ممالک کی پیداوار کو یہ غیر ممالک لے جاتے تھے۔ کیونکہ سمندری راستہ اس وقت تک تجارت کا مامون راستہ نہیں تھا لہٰذا تجار مجبوراً خشکی کے راستہ کو ترجیح دیتے تھے لیکن خشکی کا راستہ بھی طویل ہونے کے علاوہ پُرخطر ہوتا تھا اس لئے اس پر انہیں خاص توجہ کرنی پڑتی تھی۔ چنانچہ تاجر لوگ قافلے بنا بنا کر نکلتے تھے اور یہ قافلے محدود زمانوں میں اور محدود راستوں پر سفر کر سکتے تھے۔

جزیرۂ عرب میں شام اور بحرِ ہند کے درمیان دو بڑے تجارتی راستے تھے ایک شمال میں ـــ حضرموت سے بحرین تک خلیج فارس کے کنارے کنارے ـــ اور وہاں سے صور تک۔ دوسرا بھی حضرموت ہی سے شروع ہوتا تھا اور بحرِ احمر کے کنارے کنارے صحرا و نجد و ہجر کو چھوڑتا ہوا، ساحل سمندر کی پہاڑی اور دشوار گذار چٹانوں سے دامن بچاتا ہوا چلا جاتا تھا۔ اسی دوسرے راستہ پر یمن اور بطرہ کے درمیان میں نصف پر مکہ معظمہ واقع تھا۔

ان تجارتی راہوں نے عربوں کو بڑا فائدہ پہنچایا۔ اور ان کے لئے رزق کا ایک بڑا دروازہ کھول دیا۔ جو لوگ اس راستے پر واقع شہروں میں آباد تھے ان میں سے کچھ لوگ تو خود اپنے لئے تجارت کرتے تھے اور کچھ ایسے تھے جو ان تجارتی قافلوں کے ساتھ خدمت گار، ساربان، محافظ یا راہنما کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔

راستوں کی حفاظت

اگرچہ لوٹ مار کی طرف عربوں کا میلان تھا اور سرحدوں پر جو متمدن مملکتیں قائم تھیں وہ ان کو دھمکیاں بھی دیتی رہتی تھیں اور بسا اوقات ان سے برد آزمائیاں بھی ہوتی رہتی تھیں لیکن ان امور کے ساتھ ہی ان کو اپنے عہد کا زبردست پاس تھا۔ اپنے شرف اور فضیلت کا احساس تھا وہ جو وعدے کسی سے کرتے تھے اس کا ان کو لحاظ تھا۔ اس کی ان خصوصیات نے انہیں اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ اپنی پڑوسی قوموں کے ساتھ معاملت کر سکیں۔ اور تجارت کے لئے ایک وسیع اور منظم راستہ کو پرامن رکھ سکیں۔

چنانچہ بہت سے قبائل ایسے تھے جو دوسرے قبائل کی دراز دستیوں سے ان تجارتی قافلوں کی حفاظت کرتے تھے۔ جس کے صلے میں وہ کچھ مقررہ اجرت وصول کرتے تھے۔ اور اگر کسی قافلہ پر کوئی تعدی ہو جاتی تھی جس کو وہ روک نہیں سکتے تھے تو اکثر اپنی اجرت میں لی ہوئی رقوم واپس کر دیا کرتے تھے مگر زیادہ تر وہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے تھے۔ کیونکہ انہیں صحرا اور اس کے راستوں کا علم ہوتا تھا۔ اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ کون سے راستے مامون و محفوظ ہو سکتے ہیں۔ اور کون سے نہیں ہو سکتے اور اس کے ساتھ ہی انہیں گرمی کی شدت اور سفر کی مشقت برداشت کرنے کی طاقت بھی تھی۔

قدیم الزمنہ سے تجارت اہل یمن کے ہاتھوں میں تھی۔ تجارت میں یہی غالب عنصر تھا۔ انہی کے ہاتھوں حضرموت الاظفار کی پیداواریں، درآمد ہونے والی چیزیں شام اور مصر تک پہنچتی تھیں۔ پھر ان اسباب کی وجہ سے جن کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں، اہل یمن تجارت میں گرتے چلے گئے اور ان کی جگہ حجاز کے عربوں کا تجارت پر قبضہ ہوتا چلا گیا۔

حجازی تجار

چھٹی صدی ہجری سے یہی صورت چلی آ رہی تھی۔ یہ حجازی تجار یمنی اور حبشی تاجروں سے سامان خریدتے اور اپنے حساب میں انہیں شام اور مصر کے بازاروں میں فروخت کرتے تھے۔ یہ لوگ ایران کے بازاروں میں بہت کم تجارت کرتے تھے۔ کیونکہ ایرانیوں کے ساتھ تجارت حیرہ کے عربوں کے ہاتھ میں تھی۔ حجاز کے تاجروں نے مکہ معظمہ کو تجارت کی منڈی بنا لیا تھا اور اس راستہ کو اپنے حفاظت میں لے لیا تھا۔ اہل مکہ اسلام سے پہلے ـــ جب کہ ایران اور روم کے درمیان عداوت اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی ـــ تجارت میں بڑے درجہ کے مالک بن چکے تھے۔ رومیوں کو اپنی اکثر ضروریات حتیٰ کہ اپنے ترفہ و تنعم کی چیزوں مثلاً ریشم وغیرہ ـــ میں مکہ کی تجارت ہی پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا۔ بعض انگریز مورخین نے انکشاف کیا ہے کہ خود مکہ معظمہ میں رومی تجارت خانے قائم تھے جن سے اہل روم تجارتی حالات میں اور ساتھ ہی عرب کے حالات کی جاسوسی کا کام بھی لیتے تھے۔ اس طرح مکہ میں بہت سے حبشی لوگ بھی رہتے تھے۔ جو اپنی قوم کی تجارتی مصالح کی نگرانی کرتے تھے[1]۔

مکہ کے باشندوں میں مشہور ترین قبیلہ قریش تھا۔ نضر بن کنانہ ان کا جدِ اعلیٰ تھا۔ چنانچہ جو لوگ نضر کی اولاد سے تھے وہ سب قریشی کہلاتے تھے۔ بعض مورخین کی رائے تو یہ ہے کہ ان لوگوں کا نام قریش پڑا ہی اس لئے تھا کہ یہ لوگ تجارت میں مشغول رہتے تھے۔ چنانچہ لسان العرب میں ہے ـــ کہتے ہیں کہ ان لوگوں کا نام قریش اس لئے پڑ گیا تھا کہ یہ لوگ اہل تجارت تھے۔ دوسرے قبائل کے برعکس کھیتی کرنے یا جانور پالنے کا پیشہ نہیں کرتے تھے۔ قریش کا لفظ "فُلَانٌ يَتَقَرَّشُ الْمَالَ" سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہوتے ہیں: "فلاں آدمی مال کو جمع کرتا ہے"۔

اغانی میں ہے۔ "عمارہ بن ولید مخزومی اور عمرو بن العاص نجاشی کے پاس گئے یہ دونوں کے دونوں تاجر تھے۔ اور سرزمین حبشہ قریش کی ایک بڑی تجارتی منڈی تھی"[2]۔

قریش کی برتری

قریش کو اس مرتبہ تک پہنچا دینے میں ان کے جغرافیائی محل وقوع نے بڑی مدد دی۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ مکہ اس تجارتی راستہ کی نصف مسافت پر واقع تھا۔ زمزم کے چشمے سے یہ قافلے پانی حاصل کرتے تھے۔ اور راستہ کی ضرورت کے مطابق پانی ساتھ لے جاتے تھے۔ پھر قریش کعبہ والے تھے جس کی اپنی عظمت اور تقدیس تمام عرب میں مسلّم تھی۔ "لِإِيلَافِ قُرَيْشٍ إِيلَافِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ، فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَٰذَا الْبَيْتِ الَّذِي أَطْعَمَهُم مِّن جُوعٍ وَآمَنَهُم مِّنْ خَوْفٍ" زمخشری نے کشاف میں بیان کیا ہے کہ قریش دو تجارتی سفر کیا کرتے تھے۔ سردی کے موسم میں یمن جایا کرتے تھے اور گرمی کے موسم میں شام کی طرف۔ یہ لوگ سامانِ خوراک اور تجارتی ساز و سامان لاتے لے جاتے تھے۔ اپنے ان سفروں میں یہ لوگ قطعاً محفوظ رہتے تھے۔ کیونکہ یہ اللہ کے حرم کے باشندے اور اللہ کے گھر کے متولی تھے۔ چنانچہ ان سے کہیں کوئی تعرض نہ کیا جاتا تھا۔ جب کہ دوسرے قافلے راستوں میں لوٹ لئے جاتے تھے۔ بلکہ اچک لے جاتے تھے۔ حق تعالیٰ نے دوسری جگہ اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

أَوَلَمْ نُمَكِّن لَّهُمْ حَرَمًا آمِنًا يُجْبَىٰ إِلَيْهِ ثَمَرَاتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّن لَّدُنَّا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ۔

---

[1] ملاحظہ ہو اولیری کی کتاب (ARABIA BEFORE MOHAMMAD) [2] اغانی صفحہ ۵۲

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

مجلسِ اقبال

جب پروفیسر نکلسن نے مثنوی اسرارِ خودی کا انگریزی میں ترجمہ شائع کیا تو مسٹر ڈکنسن نے اقبال کے فلسفۂ خودی پر کچھ اعتراضات کئے۔ علامہ اقبالؒ نے ان اعتراضات کا جواب پروفیسر نکلسن کے نام ایک خط میں دیا۔ چونکہ حضرت علامہ کی یہ تشریحات ان کے تصورِ خودی سے متعلق بہت سے اہم گوشوں کی وضاحت کرتی ہیں اس لئے ان کا سامنے آجانا بھی ضروری ہے۔ ذیل میں حضرتِ علامہ کے اس خط کا ترجمہ شائع کیا جاتا ہے جو اُس زمانہ میں چراغ حسن صاحب حسرت نے کیا تھا۔

(طلوع اسلام)

مخدومی ڈاکٹر نکلسن

شفیع کے نام آپ نے جو مکتوب تحریر فرمایا ہے، اس سے مجھے یہ معلوم کرکے بےحد مسرت ہوئی کہ اسرارِ خودی کا ترجمہ انگلستان میں قبولِ عام حاصل کر رہا ہے۔ بعض انگریز تنقید نگاروں نے اس سطحی تشابہ اور تماثل سے جو میرے اور نیٹشے کے خیالات میں پایا جاتا ہے، دھوکا کھایا ہے اور غلط راہ پر پڑ گئے ہیں۔ "دی اینتھم" والے مضمون میں جو خیالات ظاہر کئے گئے ہیں وہ بہت حد تک حقائق کی غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ لیکن اس غلطی کی ذمہ داری صاحبِ مضمون پر عائد نہیں ہوتی۔ اُس نے اپنے مضمون میں میری جن نظموں کا ذکر کیا ہے اگر اُسے اُن کی صحیح تاریخِ اشاعت کا بھی علم ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ میری ادبی سرگرمیوں کے نشوو ارتقاء کے متعلق اُس کا زاویۂ نگاہ بالکل مختلف نظر آتا۔

وہ انسانِ کامل کے متعلق میرے تخیل کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے غلط بحث کرکے میرے انسانِ کامل اور جرمن مفکر کے فوق الانسان کو ایک ہی چیز فرض کر لیا ہے۔ میں نے آج سے تقریباً بیس سال قبل انسانِ کامل کے متصوفانہ عقیدے پر قلم اٹھایا تھا۔ اور یہ وہ زمانہ ہے جب نہ تو نیٹشے کے عقائد کا غلغلہ میرے کانوں تک پہنچا تھا، نہ اس کی کتابیں میری نظروں سے گزری تھیں۔ یہ مضمون "انڈین اینٹی کیوری" میں شائع ہوا اور جب ۱۹۰۸ء میں میں نے "ایرانی الٰہیات" پر ایک کتاب لکھی تو اس مضمون کو اس میں شامل کر لیا گیا۔

انگریزوں کو چاہیئے کہ میرے خیالات کو سمجھنے کے لئے جرمن مفکر کے بجائے ایک ہم وطن فلسفی کے افکار کو رہنما بنائیں۔ میری مراد الیگزنڈر سے ہے جس کے گلاسگو والے خطبات پچھلے سال شائع ہوچکے ہیں۔ ان خطبات میں اُس نے "خدا اور الوہیت" کے عنوان سے جو باب لکھا ہے، وہ پڑھنے کے قابل ہے۔ وہ صفحہ ۳۴۷ پر لکھتا ہے:

> گویا ذہنِ انسانی کے نزدیک الوہیت دوسری اعلیٰ تجربی قوت ہے جسے کائنات عالمِ وجود میں لانے کی سعی کر رہی ہے۔ قیاس واجتہاد کی وہ کسوٹی سے ہمیں یقین ہو چکا ہے کہ بطنِ گیتی میں اس قسم کی ایک قوت موجود ہے۔ لیکن ہم نہیں جانتے کہ وہ قوت کیا ہے۔ ہم نہ تو اُسے محسوس کر سکتے ہیں نہ ہمارا ذہن اُس کے تصور پر قادر ہے۔ انسان ابھی تک ایک نامعلوم خدا کے لئے قربان گاہیں تعمیر کر رہا ہے یہ معلوم کرنا کہ الوہیت کیا چیز ہے، اس کا احساس کیسا ہوتا ہے، اس صورت میں ممکن ہے کہ ہم خدا بن جائیں۔

الگزنڈر کے خیالات میرے عقائد کی نسبت زیادہ جسارت آمیز ہیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ کائنات میں جذبۂ الوہیت جاری وساری ہے۔ لیکن میں الگزنڈر کی طرح یہ نہیں مانتا کہ یہ قوت ایک ایسے خدا کے وجود میں جلوہ آرا ہوگی جو وقت کا تابع ہوگا۔ اس باب میں میرا عقیدہ یہ ہے کہ یہ قوت ایک اکمل واعلیٰ انسان کے پیکرِ خاکی میں ظاہر ہوگی۔ خدا کے متعلق الگزنڈر کا عقیدہ میرے عقیدے سے مختلف ہے۔ لیکن اگر انگریز ان جزوی اختلافات سے قطع نظر کرکے انسانِ کامل کے تخیل پر اپنے ایک ہم وطن مفکر کے افکار کی روشنی میں نظر ڈالیں تو انہیں یہ عقیدہ اس قدر اجنبی اور غیر مانوس نہیں معلوم ہوگا۔

مجھے مسٹر ڈکنسن کی تنقید بدرجۂ غایت دل چسپ معلوم ہوتی ہے اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اس کے متعلق چند باتیں عرض کر دوں۔

مسٹر ڈکنسن کے نزدیک میں نے اپنی نظموں میں جسمانی قوت کو منتہائے آمال قرار دیا ہے (انہوں نے مجھے ایک مکتوب لکھا ہے جس میں یہی خیال ظاہر کیا ہے) انہیں اس بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں روحانی قوت کا تو قائل ہوں لیکن جسمانی قوت پر یقین نہیں رکھتا۔ جب ایک قوم کو حق وصداقت کی حمایت میں دعوتِ پیکار دی جائے تو میرے عقیدے کے رُو سے اس دعوت پر لبیک کہنا اس کا فرض ہے۔ لیکن میں ان تمام جنگوں کو مردود سمجھتا ہوں جن کا مقصد محض کشورکشائی اور ملک گیری ہو۔

مسٹر ڈکنسن نے صحیح فرمایا ہے کہ جنگ خواہ وہ حق وصداقت کی حمایت میں ہو خواہ ملک گیری اور فتح مندی کی خاطر، تباہی اور بربادی اُس کا لازمی نتیجہ ہے، اس لئے اس کے استیصال کی سعی کرنا چاہیئے لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ معاہدے، لیگیں، پنچائتیں، اور کانفرنسیں استیصالِ حرب نہیں کر سکتیں۔ اگر ان مساعی میں ہمیں بیش از بیش کامیابی حاصل ہو جائے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ ملل مستعمرہ جن ملتوں کو تمدن وتہذیب میں اپنا ہمسر نہیں سمجھتیں انہیں اپنے جور و تعدی کا تختۂ مشق بنانے کے لئے زیادہ پُرامن وسائل اختیار کر لیں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں ایک ایسی شخصیت کی ضرورت ہے جو ہمارے معاشری مسائل کی پیچیدگیاں سلجھائے، ہمارے تنازعات کا فیصلہ کرے اور بین الملی اخلاق کی بنیاد مستحکم واستوار کر دے۔ پروفیسر میکنزی کی کتاب "انٹروڈکشن ٹو سوشیالوجی" کے یہ دو آخری پیراگراف کس قدر صحیح ہیں۔ میں یہاں انہیں لفظ بہ لفظ نقل کر دیتا ہوں۔

> کامل انسانوں کے بغیر سوسائٹی معراجِ کمال پر نہیں پہنچ سکتی۔ اور اس غرض کے لئے محض عرفان اور حقیقت آگاہی کافی نہیں بلکہ ہیجان اور تحریک کی قوت بھی ضروری ہے۔ جیسے یوں کہنا چاہیئے کہ یہ مقاصل کرنے کے لئے ہم نور وحرارت دونوں کے محتاج ہیں۔ غالباً عہدِ حاضر کے معاشری مسائل کا فلسفیانہ فہم وادراک بھی وقت کی اہم ترین ضرورت نہیں۔ ہمیں معلم بھی چاہیئے اور پیغمبر بھی۔ ہمیں آج رسکن یا کارلائل یا ٹالسٹائی جیسے لوگوں کی ضرورت ہے جو ضمیر کو زیادہ متشدد اور سخت گیر بنانے اور فرائض کے دائرے کو زیادہ وسیع کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ غالباً ہمیں ایک مسیح کی ضرورت ہے .... یہ قول صحیح ہے کہ عہدِ حاضرہ کے پیغمبر کو محض "بیابان کی صدا" نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ عہدِ حاضرہ کے "بیابان" آباد شہروں کے گلی کوچے ہیں۔ جہاں کی ترقی کی مسلسل وپیہم جد وجہد کا بازار گرم ہے۔ اس عہد کے پیغمبر کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسی ہنگامہ زار میں وعظ وتبلیغ کرے۔ غالباً ہمیں پیغمبر سے بھی زیادہ عہدِ نو کے شاعر کی ضرورت ہے۔ یا ایک ایسے شخص کا وجود ہمارے لئے مفید ثابت ہوگا جو شاعری اور پیغمبری کی دوگونہ صفات سے متصف ہو۔ عہدِ ماضی کے شاعروں نے ہمیں فطرت سے محبت کرنے کی تعلیم دی ہے۔ انہوں نے ہمیں اس قدر ژرف نگاہ بنا دیا ہے کہ ہم مظاہرِ فطرت میں انوارِ ربانی کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم ابھی ایک ایسے شاعر کے منتظر ہیں جو ہمیں اسی وضاحت کے ساتھ پیکرِ انسانی میں صفاتِ الٰہی کے جلوے دکھا دے۔ ہائنے نے ازراہِ تفنن اپنے آپ کو "روح القدس کا سپاہی" کہا تھا۔ ہمیں ایسے شخص کی ضرورت ہے جو درحقیقت روح القدس کا سپاہی ہو، جو اس حقیقت پر ہماری آنکھیں کھول دے کہ ہمارے بلند ترین نصب العین روزمرہ کی زندگی میں پورے ہو رہے ہیں۔ اور اگر اس زندگی کو ترقی دینے کی سعی کی جائے تو ہمیں محض راہبانہ ریاضت اور نفس کشی ہی کا موقع نہیں ملے گا بلکہ ایسا ارفع واعلیٰ مقصد حاصل ہو جائے گا جو تمام خیالات، تمام جذبات اور تمام مسرتوں کو ترقی کے بلند مقام پر پہنچا سکتا ہے۔

انگریزوں کو چاہیئے کہ اس نوع کے خیالات کی روشنی میں انسانِ کامل کے متعلق میرے افکار کا مطالعہ کریں۔ ہمارے عہدنامے اور پنچائتیں جنگ وپیکار کو صفحۂ حیات سے محو نہیں کر سکتیں۔ کوئی بلند مرتبہ شخصیت ہی ان مصائب کا خاتمہ کر سکتی ہے اور اس شعر میں میں نے اسی کو مخاطب کیا ہے۔ ؎

باز در عالم بیار ایامِ صلح
جنگ جویاں را بدہ پیغامِ صلح

(باقی)

عورت کا قرآن

(۴)

غیر مسلم عورتوں کے طفیل بعض مشرقی و مغربی ممالک کی مسلمان عورتوں کی آزادی بلا شبہ قابل ذکر ہے مگر وہاں چونکہ "اسلامیت" پر "مغربیت" حاوی ہے اس لئے قرآنی تعلیمات کا لحاظ نہیں کیا گیا اور نہیں کیا جاتا۔ ترکی ضرور اسلامی ملک ہے اور وہاں ۱۹۳۵ء میں عورتوں نے "کامل آزادی" حاصل کر لی ہے مگر وہ مشرق و مغرب کا سنگم ہے اس لئے اسے بھی مثال میں پیش کرنا صحیح نہ ہوگا۔ ہم "مشرقی عورتوں" کے لئے ایک دقت یہ بھی ہے کہ ہم آزادی کے حصول میں نہ تو "اسلامیت" کو نظر انداز کر سکتے ہیں اور نہ "مشرقیت" کو قربان، اس لئے کہ وہ ہماری فطرت کی صحیح ترجمان ہے۔ لہٰذا ہمارا بہترین راستہ حقیقتاً یہ ہے کہ ہم اندھا دھند جذباتی طور پر مغرب کی یا مغرب زدہ ملکوں کی عورتوں کی ریس کرنے کی بجائے اپنے وہ جائز حقوق حاصل کرنے کی جدوجہد کریں جو ہماری فطری اور مشرقی خصوصیات کو نقصان پہنچائے بغیر "قرآن مجید" نے عطا کئے ہیں کہ یہی ایک صورت ہماری فلاح کی ہے اور ہوگی، اور اسی کی روشنی میں حاصل کی ہوئی آزادی میں اللہ تعالیٰ استقامت بھی عطا فرمائے گا۔ ورنہ اگر ہم نے بلا سوچے سمجھے "یورپ" کی عورتوں کی تقلید کرنی چاہی تو یہ قرآنی لفظوں میں "طغیٰ" ہوگا۔ یعنی "خدائی حدود سے متجاوز ہو جانا"۔ جو از روئے قرآن مجید اقوام گذشتہ کی عبرت انگیز تباہی و بربادی کا سبب ہوا ہے اور جس سے قرآن مجید میں مسلمانوں کو چاہے وہ "مرد" ہوں یا "عورت" بڑی سختی سے روکا گیا ہے اور اسی لئے امت مسلمہ کو مثالی حیثیت سے اعتدال پر بنایا گیا ہے:

كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ۔ (بقرہ ۱۷)

اس طرح ہم نے تم کو ایک ایسی جماعت بنایا ہے جو اعتدال پر ہے تاکہ تم لوگوں کے لئے نگراں بنو۔

قرآن مجید میں جو قصے ہیں چاہے وہ قوموں کے ہوں یا افراد کے "مردوں کے ہوں یا عورتوں کے" اسی لئے بیان کئے گئے ہیں کہ لوگ ان پر غور و فکر کریں اور ان سے سبق لیکر "خدائی حدود" پھاندنے سے بچیں۔ اسی لئے دنیا میں "تاریخ" کی بڑی اہمیت ہے مگر بدنصیبی یہ ہے کہ

رسوا کیا اس دور کو خلوت کی ہوس نے — روشن ہے نگہ، آئینۂ دل ہے مکدر
بڑھ جاتا ہے جب ذوقِ نظر اپنی حدوں سے — ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر
آغوشِ صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے — وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر (اقبال)

ظاہر ہے کہ اس روشنی میں کچھ غور و فکر کے لئے قرآن مجید کا جاننا ضروری ہے مگر اس کا علم عام طور سے ہم عورتوں کو حاصل نہیں ہے۔ "مسلمان عورتوں" کے مسائل و حقوق سے متعلق اردو زبان میں ایک تو کتابیں لکھی ہی گئی بہت کم ہیں۔ دوسرے جو چھوٹی بڑی دو چار کتابیں اسی سلسلے کی ہیں بھی، ان میں "عورت" کے کسی مسئلہ اور حق پر محض دستورِ اسلامی یعنی صرف قرآن مجید کی روشنی میں اظہار خیال نہیں کیا گیا ہے۔ مصنف حضرات جس مسئلے سے بحث کرتے ہیں اُسے "اسلامی نقطۂ نظر" کہتے ہیں اور "اسلام" ان کے یہاں صرف قرآن مجید میں نہیں ہے بلکہ "اسلام" میں ان کے نزدیک قرآن مجید کے علاوہ اور بھی بہت سے انسانوں کی لکھی ہوئی بیشمار کتابیں داخل اور شامل ہیں اور پھر یہ کتابیں یا ان کے مضامین بھی مسلّم نہیں جن پر جمہور کا اتفاق ہو۔ حالانکہ چاہئے یہ تھا کہ قرآن مجید کی آیات پیش کر کے قرآن مجید اور صرف قرآن مجید ہی کی روشنی میں ان مسائل و حقوق کو سمجھایا جاتا تاکہ ہمیں "فقہاء اور علماء کا خیال" نہیں بلکہ "خدا کا حکم" معلوم ہوتا۔ پھر ان موجودہ کتابوں میں کوئی بھی "عورت" کے تمام مسائل اور سارے حقوق پر حاوی نہیں ہے۔ کسی مصنف نے ایک مسئلے کو لے لیا اور پوری کتاب لکھ ڈالی بعض نے دو چار حقوق سے کے ان پر زورِ قلم صرف کیا۔ اور پھر ان میں تحریر کا انداز یہ ہے یا ہوتا ہے کہ گویا وہ حقوق "عورت" کو "خدا" نے نہیں مردوں نے دیئے ہیں جن کے احسان سے ہم کبھی بھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ غرض اس وقت اردو زبان میں کوئی ایسی کتاب موجود نہیں ہے جس میں کلام پاک کی صرف وہ آیتیں پیش کی گئی ہوں جو عورت سے متعلق ہیں تاکہ ایک مسلمان عورت اگر یہ جاننا چاہے کہ قرآن مجید میں ہمارے لئے بطور خاص کیا کیا احکام ہیں اور وہ کہاں کہاں پر ہیں، تو وہ انھیں دیکھ اور پا سکے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عورت کی ایسی ہی اہمیت ہے کہ اس نے اپنی مقدس کتاب میں کوئی سورۃ "الرجل" (مرد) کے نام سے تو نازل اور منسوب و معنون نہیں کی ہے مگر ایک مستقل سورۃ "النساء" (عورت) کے عنوان سے نازل اور منسوب و معنون کی ہے جو سورہ بقرہ اور اعراف کے بعد قرآن مجید کی سب سے بڑی سورۃ ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم پاکستانی و ہندوستانی مسلمان عورتیں قرآن مجید کی تلاوت[1] ہر گھر میں کر لی ہیں مگر جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے شروع ہی سے یہ خاص خیال رکھا گیا کہ مسلمان عورت قرآن شریف سے باخبر نہ ہونے پائے اس لئے نہ ہمیں باضابطہ اتنی تعلیم دلائی جاتی ہے کہ ہم اپنے حقوق و مسائل کا احساس و ادراک کر سکیں نہ ہماری زبان عربی ہے کہ ہم قرآن مجید کی تلاوت کے وقت اس کو سمجھ سکیں۔ نہ قرآن مجید کو ہمیں ترجمہ کے ساتھ باقاعدہ پڑھایا جاتا ہے کہ ہمیں کچھ معلوم ہو سکے۔ حد تو یہ ہے کہ عام طور سے جہیز کے سامانوں کے ساتھ قرآن مجید کا جو نسخہ ہمیں دیا جاتا ہے وہ بھی بطور خاص یہ دیکھ کر کہ وہ بے ترجمہ ہو، تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ عورت یہ جان لے کہ خدا نے مسلمان عورت کو کیا کیا حقوق دیئے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب کے وجود میں آنے کا محرک یہی جذبہ ہے۔

اسلام کا دستور العمل قرآن مجید ہے اور بعض فروع کے ساتھ، ورنہ سارے اصول اس میں موجود ہیں۔ اب اگر یہ کتاب "عورت" کے سامنے رہی تو اسے معلوم رہے گا کہ عورت سے متعلق قرآن مجید میں یہی کچھ ہے۔ بقیہ قرآن مجید اصولی حیثیت رکھتا ہے۔ عبادات و معاملات میں قرآن مجید نے کوئی تفریق نہیں کی ہے۔ معاشرتی اور سماجی مسائل میں عورت اور مرد دونوں کو مساوی حق دیا گیا ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ جس طرح مرد پر فرض ہیں اسی طرح عورت پر۔ سچ بولنا، جھوٹ سے پرہیز کرنا، چوری، جوا، حرام سے بچنا، دوسروں کی تحقیر و تذلیل نہ کرنا، لوگوں کا نقصان نہ کرنا، یتیموں کا مال نہ کھانا، تکبر نہ کرنا، امانت میں خیانت نہ کرنا، غیبت تمسخر، عیب چینی، اور چغلی سے احتراز کرنا۔ غرض جسقدر بھی اخلاقی مسائل و فرائض ہیں وہ دونوں کے لئے یکساں ہیں۔ مثلاً علم کو لیجئے کہ اس میں مرد اور عورت کی کوئی تخصیص نہیں، خداشناسی کے لئے حصولِ علم کا عام حکم ہے۔ دونوں کے لئے یکساں لازمی حیثیت رکھتا ہے۔

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (فاطر ۴)

خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو صاحب علم ہوتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس آیت کی روشنی میں خدا سے ڈرنے کے لئے بندے کا علم حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس لئے کہ خداشناسی کا انحصار اسی پر ہے اور اس علم کے حصول کے لئے نہ مرد کی تخصیص کی گئی ہے نہ عورت کی۔ خدا کے بندے مرد بھی ہیں عورت بھی، اور خدا سے ڈرنا مرد کے لئے بھی ضروری ہے اور عورت کے لئے بھی۔ لہٰذا جس علم سے بھی دماغ میں روشنی، عقل میں جلا اور نفس میں پاکیزگی آئے اُسے جس طرح مرد حاصل کرتے ہیں اسی طرح عورت کو بھی حاصل کرنا چاہئے مگر ہاں اس میں بھی کلام نہیں ہے کہ بقول حضرت اقبال:

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن — کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن — ہے عشق و محبت کیلئے علم و ہنر موت

رہے وہ مسائل جن کی جزئیات قرآن نے متعین نہیں کیں — اور ایسے مسائل ملیں گے اسلئے کہ نزولِ قرآن کے وقت جب خدائی احکام کو زیادہ سے زیادہ جاننے کے متمنی مومنین، ہر باب میں واضح ہدایت چاہتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے انتہائی کرم فرمائی اور رحمت کے پیش نظر یہ کہہ کے روک دیا تھا کہ

(۱) اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ (بقرہ ۱۳)

کیا تم چاہتے ہو کہ تم بھی اپنے رسول سے ویسے ہی سوالات کرو جیسا کہ اس سے پہلے موسیٰ سے کئے جا چکے ہیں؟

(۲) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ۗ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ۔ (مائدہ ۱۳)

مسلمانو! اپنی طرف سے کاوش کر کے ان چیزوں کی نسبت سوالات نہ کرو کہ اگر تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں گوارا نہ ہوں۔ اگر ان چیزوں کے بارے میں سوال کرو گے جبکہ قرآن نازل [illegible]

[1] تلاوت کے معنی پیچھے پیچھے چلنا ہیں۔ یعنی جو قرآن رہبری کرتا ہے اس کی تقلید کرو۔ مگر مسلمانوں کے ہاں اس کا مطلب بے سمجھے بوجھے الفاظ کو دہرانا ہوگیا۔

وہ مردِ درویش ۔۔۔۔

(پرویز)

غالباً ۱۹۳۰-۳۱ء کا ذکر ہے۔ میں نے (جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کے) رسالہ جامعہ میں حدیث کے متعلق ایک مضمون دیکھا۔ اس کا بیشتر حصہ خود میرے خیالات کا ترجمان تھا لیکن بعض مقامات ایسے بھی تھے جن میں مجھے کچھ تردد تھا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں نے اس موضوع پر اس قسم کا مضمون دیکھا ہو۔ سلجھی ہوئی عبارت۔ خیالات صاف اور واضح۔ سادہ انداز۔ الفاظ کم از کم لیکن ہر لفظ اپنے مقام پر منتخب، محکم اور نجو خزیدہ۔ دلائل دلکش۔ تبحر عالمانہ لیکن اسلوبِ بحث طالب العلمانہ۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ہر دعوے کی تائید قرآن سے۔ مضمون پڑھنے کے ساتھ ہی صاحبِ مضمون سے ملنے کا شوق دل میں ابھرا۔ اسی وقت خط لکھا اور تیسرے ہی دن (ایک دوست کی زبانی) اس کا جواب آگیا۔ چنانچہ میں اتوار کے دن دوپہر کے وقت قرول باغ پہنچا۔ قرول باغ اس زمانہ میں مختصر سی بستی تھی اور زیادہ تر جامعہ ملیہ کی وجہ سے مشہور۔ چنانچہ وہاں "چھپر والے کنوئیں" کو تلاش کرنے میں زیادہ دقت نہ ہوئی۔ مکان پر پہنچا۔ دستک دی۔ دروازہ کھلا تو خود صاحبِ خانہ (اور صاحبِ مضمون) میرے سامنے تھے۔ بلند قامت۔ سر کے بال قریب قریب سفید لیکن مانگ نکلی ہوئی۔ کھچڑی ڈاڑھی، لیکن تراش موزوں۔ گاڑھے کا کرتہ اور گاڑھے ہی کا پاجامہ۔ ازاربند کرتے سے نیچے لٹکا ہوا اور اس میں ایک چابی بندھی ہوئی۔ پاؤں میں دیسی جوتا۔ پیشانی کشادہ۔ ایک آنکھ کی سیاہی ذرا اپنے مقام سے ہٹی ہوئی۔ لبوں پر مسکراہٹ اور چہرے پر بشاشت اور متانت کا ایسا امتزاج جو خیالات کی پاکیزگی اور حسن ذوق کا آئینہ دار ہو۔ میں نے اپنا نام بتایا تو بڑے شفقت آمیز انداز سے اندر آنے کے لئے کہا۔ کمرے کے اندر پہنچے تو مکان خود مکین کی سادگی کا مظہر۔ سامنے ایک چٹائی بچھ رہی تھی جس پر لکڑی کا ایک چھوٹا سا ڈسک تھا اور اس پر لکھنے پڑھنے کا مختصر سا سامان —— قلم، دوات، تھوڑے سے کاغذ۔ اسی چٹائی پر بیٹھ گئے اور دو ہی چار باتوں کے بعد ایسا محسوس ہونے لگا جیسے ہم مدتوں کے ملاقاتی ہوں۔ ان کی باتوں کا بھی وہی انداز تھا جو تحریر کا تھا۔ مختصر، جامع، دلنشین، صاف، واضح اور شگفتہ جن میں سادگی کے ساتھ عجیب قسم کا معصومانہ انکسار بھی تھا۔ قرآن —— سینے، دل اور دماغ، تینوں میں۔ کتب روایات و سیر پر عبور۔ تاریخ امم بالخصوص مسلمانوں کی تاریخ پر گہری نظر۔ شعر کا ذوق نہایت پاکیزہ۔ مذکورہ صدر مضمون کے اختلافی مقامات کے متعلق گفتگو رہی۔ میرے اعتراضات میں (بہ تقاضائے عمر —— میں اس وقت ۲۶/۲۷ برس کا تھا) شدت اور جوش تھا۔ ان کے جواب میں نرمی اور متانت۔ باتیں ہو رہی تھیں کہ دو تین اور حضرات ملنے کے لئے آگئے۔ ان میں ایک تو مولانا عبدالقادر قصوری (مرحوم) اور ایک صاحب بمبئی کونسل کے ممبر اور تیسرے صاحب کسی ریاست کے عہدیدار۔ انھیں بھی اسی بے تکلفی سے چٹائی پر بٹھا دیا گیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم تو مولانا! چائے پینے کے لئے آئے ہیں۔ مسکرا کر کہا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ یہ کہہ کر خود ہی اندر گئے (گھر میں ملازم کوئی نہیں تھا) پہلے ایک دسترخوان لا کر بچھا دیا جو بتا رہا تھا کہ وہ گاڑھے کے پرانے کرتوں کو دھلوا کر تیار کیا گیا ہے۔ پھر چار پانچ پرچیں پیالیاں (جن میں شاید ہی کوئی صحیح سالم ہو) ایلومینیم کی ایک چائے دانی۔ میں ان چیزوں کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس تکلف کے دور میں اس قدر سادگی کے لئے کتنے بڑے وسیع ظرف اور بلند نگاہ کی ضرورت ہے!

یہ تو تھا چائے کا سامان۔ لیکن جب صاحب خانہ نے چائے پر گفتگو شروع کی تب معلوم ہوا کہ آنے والوں نے خاص طور پر چائے کی فرمائش کیوں کی تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی (غبارِ خاطر میں) اپنی چائے کی رنگینی اور گرم جوشی کا بڑا حسین نقشہ کھینچا ہے۔ لیکن چائے کا جو نقشہ وہاں کھینچ رہا تھا اس میں اور غبار خاطر کے نقشے میں اتنا ہی فرق سمجھئے جتنا فرق بادیہ نشین عربوں کے قہوۂ نخلستانی اور عجمی محفلوں کے بادۂ ارغوانی میں ہوتا ہے۔ گفتگو میں عربوں کی سی سادگی۔ بے تکلفی، سینہ کی کشادگی۔ ذوق کی پاکیزگی اور شگفتگی، اُبل اُبل کر سامنے آرہی تھی، حتیٰ کہ لطائف بھی عربی کتب محاضرات ہی کے تھے۔ قریب ایک گھنٹہ تک یہ محفل گرم رہی —— وہ محفل جس میں خلوص کی پہنائیاں، علم کی گہرائیاں اور ذوق کی بلندیاں سب سمٹ کر آگئی تھیں۔

یہ تھی علامہ اسلم جیراجپوری (مدظلہٗ) سے میری پہلی ملاقات۔ دنیا میں خیالات کی ہم آہنگی کا رابطہ بھی عجیب رابطہ ہے اور جب اس ہم آہنگی کی بنیاد قرآن پر ہو تو پھر اس قلبی تعلق کا پوچھنا ہی کیا۔ (یہ میرا عمر بھر کا تجربہ ہے کہ جن لوگوں سے قرآن کے بنیادوں پر تعلق پیدا ہوا وہ رشتہ بڑا ہی محکم رہا)۔ چنانچہ چند ہی دنوں کے بعد صورت یہ ہو گئی کہ میری فرصت کے بیشتر اوقات انہی کے پاس گذرنے لگے۔ اس زمانے میں ہمارے دفاتر چھ ماہ کے لئے (سردی میں) دہلی رہا کرتے تھے اور گرمیوں کے چھ مہینے شملہ میں۔ گرمی کے موسم میں جامعہ میں کم و بیش تین ماہ کی تعطیلات ہو جاتیں اور مولانا اپنے وطن تشریف لیجاتے۔ [علامہ اسلم، اپنے وطن میں "حافظ صاحب" اور جامعہ میں "مولانا" کے لقب سے متعارف تھے (اور اب بھی ہیں) یہ لقب ان کے لئے ایسا ریزرو ہو چکا تھا کہ ہر شخص جانتا تھا کہ جب صرف "مولانا" کہا جائے تو اس سے کون مراد ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر وہ احباب کے حلقے میں بھی "مولانا" کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ بعض اوقات، اتفاقات کی ستم ظریفی بھی عجیب ہوتی ہے۔ جو شخص "مولانائیت" سے اتنی دور نکل چکا ہو وہ عمر بھر "مولانا" کے نام سے موسوم رہے۔ یہ اتفاقات کی ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے!] بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ مولانا سے میرا ملنا موسم سرما ہی میں ہوا کرتا تھا۔

میں عربی ادب کی بعض کتابوں میں ناپختگی محسوس کیا کرتا تھا۔ میں نے چاہا کہ اس موقعہ سے فائدہ اٹھاؤں اور عندالفرصت مولانا سے یہ کتابیں از سر نو پڑھ لوں۔ چنانچہ (غالباً ۱۹۳۵ء میں) میں نے اس کے متعلق مولانا سے ذکر کیا اور وہ اس کے لئے بخوشی رضامند ہو گئے۔ چنانچہ میں شملہ سے تنہا دہلی آگیا اور چونکہ مولانا بھی اس زمانے میں اکیلے ہی رہتے تھے اس لئے فیصلہ یہی ہوا کہ میں انہی کے ساتھ رہوں۔ یہ چھ مہینہ کا عرصہ میری زندگی کے یادگار دنوں میں سے ہے۔ میں آیا تو تھا عربی ادب کی ناپختگی دور کرنے کے لئے لیکن [وہ جو کہتے ہیں —— کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے] ہمارا بیشتر حصہ قرآن کے رموز و غوامض پر بحث و تحقیق میں گذرتا۔ اس زمانے میں مولانا کا ایک ملازم تھا رحمت اللہ۔ وہی روٹی پکاتا تھا (بلکہ اسے روٹی پکانا بھی میں نے ہی سکھایا تھا)۔ اور مولانا کا چھوٹا لڑکا (عزیزی معظم سلمہ اللہ تعالیٰ جو اس زمانے میں طبیہ کالج میں پڑھتا تھا اور اب اعظم گڈھ میں ایک کامیاب طبیب ہے) یہ ساتھ تھے۔ اوپر کے کمرے میں میری اور مولانا کی چارپائی آمنے سامنے بچھی رہتی۔ رحمت اللہ مولانا کو حقہ بھر کر دے جاتا اور ہم باتوں میں مصروف رہتے۔ ان باتوں کا محور تو (ظاہر ہے) قرآن ہوتا لیکن شاید ہی کوئی ایسا موضوع تھا جو اس محور کے گرد نہ گھومتا۔ میں اس زمانے میں (اپنی تصنیف) معارف القرآن کے ابتدائی مراحل میں سے گذر رہا تھا اس لئے میرے پیش نظر بھی ہر وقت قرآن رہتا تھا۔ اور مولانا کے تو سینہ ہی میں قرآن تھا۔ معلوم اس چھ ماہ کے عرصہ میں ہم نے قرآنی تحقیق کے ضمن میں کتنا کچھ کنگھال ڈالا۔ میں نے اپنی حیثیت ہمیشہ ایک شاگرد کی سی سمجھی لیکن مولانا کی کشادہ نگہی کا یہ عالم تھا کہ بڑے سے بڑے مسئلہ پر بھی انھوں نے اگر دیکھا کہ میری رائے صحیح ہے تو وہ اسے ایسی خندہ پیشانی سے قبول کر لیتے کہ بعض اوقات مجھے شبہ گذرنے لگتا کہ وہ کہیں میرے پاس خاطر سے ایسا تو نہیں کرتے۔ [لیکن بعد کے تجربے نے بتایا کہ دین کے معاملہ میں مولانا کسی کے پاس خاطر سے نہ کوئی بات قبول کرتے ہیں نہ کوئی خیال چھوڑتے ہیں۔ وہ اختیار صرف اسے کرتے ہیں جسے حق سمجھتے ہیں۔ اور اگر کسی بات کے متعلق تحقیق ہو جائے کہ وہ قرآن کے مطابق نہیں تو اسے نہایت جرأت اور آسانی سے جھٹک کر الگ کر دیتے ہیں]۔ اس قیام کے دوران میں مولانا کا علمی تبحر، قرآن سے عشق اور سب سے بڑھ کر ان کی سیرت و کردار کی بلندی نکھر کر میرے سامنے آگئی۔ میں نے دیکھا کہ (بذریعہ ڈاک استفتاؤں کے علاوہ) ممالکِ اسلامیہ کے جید علما اور مشاہیر اکثر انھیں ملنے کے لئے آتے اور اہم مسائل پر ان سے استفادہ کرتے۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ اگرچہ حدیث کے متعلق ان کا مسلک اہلِ حدیث سے مختلف تھا اور فقہ کے متعلق اربابِ فقہ سے الگ۔ لیکن اہل حدیث اور اہل فقہ کے بڑے بڑے علماء اس انداز سے آپ کے پاس آتے جیسے کوئی شاگرد استاد کے پاس یا کوئی خورد اپنے بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ ملتِ اسلامیہ کا درد ان کے رگ و پے میں سرایت کئے تھا۔ مصر ہو یا حجاز۔ شام ہو یا ترکی۔ ایران ہو یا ہندوستان۔ کہیں مسلمانوں پر کوئی آفت آئے مولانا مضطرب و پریشان ہو جاتے اور ان کی خیر طلبی کی دعائیں مانگنے لگتے۔ ان کا معمول یہ تھا کہ وہ رات کو تین بجے کے قریب اٹھتے۔ تہجد پڑھتے۔ حفظ کردہ قرآن کی منزل دہراتے۔ اس کے بعد نہایت عجز و الحاح سے دعائیں مانگتے۔ اپنے لئے قرآن سمجھنے اور قرآن پر چلنے کی دعا اور باقیوں کے لئے اس عمومی دعا کے علاوہ ان کی پریشانیاں دور ہونے کی دعائیں۔ (ان دعاؤں میں میرا نام التزاماً شامل ہوتا اور

چہ عجب کہ اب تک شامل ہوتا ہو)۔ افراد کے بعد ملت کی اجتماعی بہبودی کے لئے دعائیں مانگتے۔ اس کے بعد اللہ کے حضور ایک خاص سجدۂ شکرانہ گزارتے جس میں نہایت عجز اور مسرت سے کہتے کہ "مجھ سے زیادہ اس دنیا میں خوش نصیب کون ہو سکتا ہے جسے، اے میرے پروردگار! تیرے سوا نہ دنیا میں کسی کی محتاجی ہے نہ کسی کا ڈر"! وہ اس دوران میں مجھے کبھی نہ جگاتے۔ سمجھتے کہ میری عمر ابھی سونے کی ہے [اگرچہ میں ایسی کچی نیند کا واقعہ ہوا ہوں کہ ذرا سی آہٹ سے میری آنکھ کھل جاتی ـــ اور اب تک یہی عالم ہے۔ لیکن میں نیم بیدار نیم خفتہ بستر ہی پڑا رہتا تاکہ ان کے تخلیہ میں خلل انداز نہ ہوں] اس کے بعد وہ تھوڑی سی ورزش کرتے اور مجھے آواز دیتے کہ صبح کی نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ مکان سے ملحقہ مسجد میں نماز کے لئے جاتے۔ وہاں کا امام، عام "پکی روٹی" والا امام تھا لیکن مولانا ہمیشہ اسی کے پیچھے نماز پڑھ لیتے۔ مجھے کبھی کبھی اس کا خیال بھی آتا لیکن وہ ہمیشہ یہ کہہ کر روک دیتے کہ یہ امام محلہ والوں کا منتخب کردہ امام ہے اس لئے نماز اسی کو پڑھانی چاہئے۔ نماز سے واپسی پر چائے ملتی۔ دو پیالی چائے (خواہ کسی برانڈ کی ہو۔ بلکہ برانڈ کا لفظ تو میں نے استعمال کیا ہے۔ وہاں کبھی برانڈ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا) اور اس کے ساتھ ایک پیسے والا نان پاؤ۔ یہ ہوتا عام طور پر ان کا ناشتہ۔ لیکن (جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں) چائے کا وقت تو ان کے لئے (غالب کے الفاظ میں) "شگفتنِ گل ہائے ناز" کا وقت ہوتا۔ میں اس زمانے میں چائے نہیں پیتا تھا اس لئے چائے کے وقت سب سے پہلا موضوع "میری ہی کم نصیبی" ہوتا۔ اس کے ساتھ ہی دلچسپ لطائف۔ کتب محاضرات کے شہ پارے۔ عربی، فارسی اور اردو کے نہایت پاکیزہ اور بلند پایہ اشعار بعض اوقات خود اپنے (پرانے) اشعار بھی [کیونکہ اس زمانے میں انھوں نے شعر کہنا چھوڑ دیا تھا]۔ چائے کے بعد حقہ کی ایک چلم۔ پھر وہ جامعہ تشریف لے جاتے اور میں دفتر آجاتا۔

مولانا کی "درویشی" کا یہ عالم تھا کہ وہ علی گڈھ کالج کی پروفیسری چھوڑ کر جامعہ میں آئے تھے [جامعہ میں چھوٹے بڑے سب ان کی دل سے عزت کرتے اور ان کا نام بڑی ہی عقیدت اور احترام سے لیتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ عزت اور عقیدت کے بجائے "محبت" کا لفظ اس کیفیت کا زیادہ بہتر ترجمان ہو گا]۔ جامعہ پر اس زمانے میں بڑی عسرت کا دور تھا۔ ویسے تو وہاں تمام اساتذہ کا مشاہرہ اسی روپے مقرر تھا لیکن مالی دشواریوں کی وجہ سے ملتے صرف چالیس ہی تھے۔ ایک وقت وہ بھی آیا کہ یہ چالیس بھی کئی مہینوں تک نہ مل سکے۔ میں نے مولانا کو اس زمانے میں بھی کبھی پریشان نہ دیکھا۔ مجھ پر اس کا اثر تھا لیکن ان پر اس کا مطلقاً کوئی اثر نہیں تھا۔ وہ بالکل ویسے ہی مطمئن اور شاداں و فرحاں زندگی بسر کرتے۔ وہ جو اقبال نے کہا ہے کہ ـــ

بااضطرابِ موج سکونِ گہر بدہ ـــ تو میں نے مولانا کے قلب کو اس کا صحیح مظہر پایا۔ انھوں نے اپنی زندگی کو اس قدر سمٹا رکھا تھا کہ جس مقام پر لوگ عسرت محسوس کرنے لگتے ہیں وہ ان کی زندگی کا معمول بن چکا تھا۔ لیکن یہ سمٹاؤ بخل کی وجہ سے نہ تھا بلکہ سیرچشمی اور مومنانہ استغناء کی بنا پر تھا۔ (میں مولانا سے بعد معذرت اس حقیقت کا انکشاف کر رہا ہوں کہ) ان کی آمدنی کا بیشتر حصہ مستحقین کی امداد میں صرف ہوتا تھا اور وہ اس کا کسی کو علم تک بھی نہیں ہونے دیتے تھے اور اس امداد کی بعض شکلیں بھی عجیب ہوتیں۔ (مثلاً) ایک دفعہ کا ذکر ہے [اور یہ اس زمانے کے بعد کا واقعہ ہے جب میں ان کے ہاں قیام پذیر تھا] کہ ایک شام میں ان کے ہاں پہنچا تو کھانے کا وقت تھا۔ سالن میں شلغم تھے۔ معظم میاں کو شلغم ناپسند تھے۔ آلو بہت پسند تھے۔ [جب میں وہاں ٹھہرا ہوا تھا تو "کیا پکے گا" کے مسئلہ پر ہم اور معظم اکثریت میں ہوتے اور مولانا اقلیت میں رہ جاتے]۔ میں نے پوچھا کہ کیا معظم یہاں نہیں جو آج پھر شلغم پک رہے ہیں۔ ہنس کر کہا کہ نہیں۔ ان شلغموں کی کہانی بڑی دلچسپ ہے۔ تم نے نیچے "بڑے میاں" کو دیکھا ہے؟ یہ جہلم کے رہنے والے ریٹائرڈ فوجی سپاہی ہیں۔ دو چار دن ہوگے ملازمت کی تلاش میں آگئے۔ میں نے پوچھا کہ بڑے میاں روٹی پکانا جانتے ہو۔ کہنے لگا کہ جی ہاں! فوجی سپاہی کو کیا نہیں آتا۔ میں نے کہا کہ اچھا ہماری روٹی پکا دیا کرو۔ لیکن میں نے دیکھا کہ اسے روٹی۔ سالن کچھ بھی تو پکانا نہیں آتا۔ جب میں نے کہا کہ میاں! یہ کام تو تجھ سے نہیں ہو سکے گا تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے اپنی درد بھری داستان سنائی۔ جسے سننے کے بعد اسے الگ کر دینے کا سوال ہی پیدا نہ ہوا۔ اب یہ روز کوئی نہ کوئی دلچسپ بات کر دیتا ہے۔ آج صبح میں نے کہا کہ بڑے میاں تمہیں کوفتہ پکانا آتا ہے۔ کہنے لگا "کوفتہ کوفتہ۔ گول گول" میں نے کہا ہاں، گول۔ گول۔ کہنے لگا پکا لوں گا۔ اب جو شام کو کھانا سامنے آیا تو اس میں شلغم ہیں۔ میں نے پوچھا تو کہنے لگا کہ یہی تو ہیں گول۔ گول۔ گونگلو (پنجاب میں شلغم کو گونگلو کہتے ہیں)۔ یہ کہہ کر مولانا کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اس کے بعد جب تک وہ بڑے میاں خود ہی ملازمت چھوڑ کر نہیں چلے گئے، مولانا نے کبھی ایک لفظ بھی ترشروئی سے نہیں کہا۔ اس نے جو کچھ پکا دیا، ہنس کر کھا لیا (یا علیگڈھ کی پرانی اصطلاح میں، یوں کہئے کہ "کھا دیا")۔

ویسے تو مجھے بہت سے واقعات یاد ہیں جن سے مولانا کی وسعتِ ظرف اور بلندیٔ سیرت کا اندازہ ہو سکتا ہے، لیکن ان میں ایک واقعہ ایسا ہے جس کے نقوش میرے دل کی گہرائیوں میں اترے ہوئے ہیں۔ ایک دفعہ مولانا نے ہندوستان کے ایک نامور اہل قلم کی کتاب پر تبصرہ لکھا جس میں بتایا کہ اس کتاب میں کتنی باتیں قرآن کے خلاف ہیں۔ یہ تبصرہ ان پر ذرا سخت پڑا۔ اس زمانے میں خود مولانا کی ایک کتاب زیرِ طباعت تھی جس کا چرچا علمی حلقے میں پہلے ہی سے ہو رہا تھا۔ ان صاحب کے مجھ سے بھی مراسم تھے۔ وہ میرے پاس آئے اور مولانا کی کتاب کو ایک فتنۂ عظیم قرار دیکر کہا کہ میں اس کے خلاف لکھوں۔ میں نے کہا کہ میں جب تک اس کتاب کو دیکھ نہ لوں اس وقت تک اس کے مخالف کس طرح کچھ لکھ سکتا ہوں۔ انھوں نے بہت اصرار کیا لیکن میں اس پر آمادہ نہ ہوا۔ جب وہ مجھ سے مایوس ہوگئے تو وہ جامعہ میں پہنچے اور وہاں اس (آنے والی) کتاب کے خلاف محاذ قائم کرنے کی کوششیں شروع کیں اور وہ اس حد تک کامیاب بھی ہو گئے کہ وہ کتاب مکتبۂ جامعہ کی طرف سے شائع نہ ہو۔ یہ سب کچھ مولانا کے علم میں تھا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ مولانا نے ان کے متعلق نہ ان سے کبھی ایک حرف تک کہا اور نہ ہی ان کے ساتھ اپنے تعلقات میں کوئی فرق آنے دیا۔ یہ کچھ انھوں نے ظاہر داری کے طور پر نہیں کیا تھا۔ اس لئے کہ ظاہر داری مولانا کی طبیعت کے یکسر خلاف ہے۔ ان کے دل میں فی الواقعہ ان صاحب کے خلاف کوئی ملال نہیں تھا۔ اس لئے کہ اس کے بعد کئی مرتبہ یہ واقعہ زیرِ گفتگو آیا اور مولانا ہمیشہ یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے کہ وہ معذور ہیں۔ ان کی طبیعت ہی ایسی ہے۔ ان کے علاوہ کئی اور لوگ بھی تھے جو آئے دن مولانا کے خلاف کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے اور ان میں بعض نہایت پست سطح پر بھی اتر آتے۔ لیکن میں نے ان میں سے کسی کے خلاف مولانا کی زبان سے ایک لفظ بھی تلخی کا نہیں سنا۔

یوں تو اس عرصہ میں مولانا سے ہر ملاقات ایک نہ ایک اثر چھوڑ جاتی تھی لیکن شروع جنوری ۱۹۳۸ء میں لاہور کا سفر، ایک یادگار واقعہ ہے۔ انٹر کالجیٹ مسلم برادرہڈ کے زیرِ اہتمام لاہور میں (غالباً پہلا) یومِ اقبال منایا گیا اور اس میں شرکت کے لئے احباب دہلی کا قافلہ مولانا کی زیرِ قیادت روانہ ہوا۔ افرادِ کارواں میں، راقم الحروف کے علاوہ، محترم اسد ملتانی صاحب، شیخ سراج الحق اور (ہمارے ایک مرحوم دوست) قاضی محمد اشرف تھے۔ یومِ اقبال کے اجتماعات میں شرکت کے علاوہ، خود علامہ اقبال سے (ہماری آخری) ملاقات زندگی کے ناقابلِ فراموش لمحات میں سے تھی۔ اس تقریب اور اس ملاقات کا حال خود مولانا نے بھی ایک مضمون میں قلمبند فرمایا تھا (جو غالباً رسالہ نیرنگِ خیال کے اقبال نمبر میں شائع ہوا تھا)۔ نیز، علامہ اقبالؒ سے اس آخری ملاقات کی روئداد میں نے بھی ایک مقالہ میں محفوظ کر لی تھی جو طلوعِ اسلام میں شائع ہوا تھا۔ (اب یہ روئداد، علامہ اقبال سے متعلق میرے مجموعۂ مضامین میں شامل ہو گی) میں ۱۹۳۸ء میں طلوعِ اسلام شائع ہوا تھا تو مولانا نے اسے اپنی خصوصی (قلمی) اعانت سے نوازا۔ جب جامعہ اوکھلا میں چلا گیا (جو نواحاتِ دہلی میں ایک بستی ہے) تو صورت یہ رہتی کہ جمعہ کے روز (جب جامعہ میں چھٹی ہوتی) مولانا میرے ہاں تشریف لے آتے اور اتوار کے دن میں معہ اپنے دیگر احباب کے، جو مولانا سے بھی اتنے ہی قریب تھے جتنے مجھ سے، اوکھلا چلے جاتے۔ یوں تو مولانا کے ملنے والوں کا حلقہ بہت وسیع تھا جس کی وسعتیں ہندوستان سے باہر تک پھیلی ہوئی تھیں، (اور اب بھی ہیں) لیکن جو خصوصی اور قلبی تعلق انھیں اس حلقۂ احباب سے تھا وہ شاید کسی اور کے حصہ میں نہ آیا ہو گا۔ اس اعتبار سے اس حلقۂ احباب کی مجلس ایک خاص رنگ لئے ہوتی تھی۔ اتوار کی دوپہر، باہر دھوپ میں چارپائیاں بچھ جاتیں۔ دریا کی تازہ مچھلی آجاتی۔ کڑھائی چڑھ جاتی۔ مچھلی تلی جا رہی ہے، اور اہم ترین مسائل و حقائق پر گفتگو ہو رہی ہے۔ احباب میں بے لوث تعلق۔ قلبی یگانگت۔ مخلصانہ محبت۔ خیالات میں یک جہتی۔ ذوق کی ہم آہنگی۔ باہمی کوئی راز نہیں۔ درمیان میں کوئی پردہ حائل نہیں۔ کسی قسم کی مغائرت نہیں۔ ایک دوسرے میں کسی غلط فہمی کا اندیشہ نہیں۔ فرقِ مراتب ضرور ملحوظ رکھا جاتا لیکن مولانا نے اپنے آپ کو کبھی باقی احباب سے بڑا محسوس نہیں ہونے دیا۔ ان محفلوں کے متعلق میرے ہی نہیں بلکہ دیگر احباب کے بھی یہ تاثرات تھے کہ مولانا کی موجودگی میں دل کو ایک خاص قسم کا انبساط اور سکون حاصل رہتا تھا۔

محفل کیا، حقائق و لطائف کی سمٹی ہوئی دنیا ہوتی۔ گفتگو نہایت حسین لیکن شگفتہ و شاداب۔ پرمغز لیکن صاف اور سادہ۔ ٹھوس لیکن رواں اور شیریں۔ موضوع ہمیشہ واقعات اور اشیا سے متعلق ہوتے۔ ذاتیات ان میں کبھی نہ آنے پاتیں۔ اگر کسی کی ذات درمیان میں آ بھی جاتی تو نہ کسی کی بے جا تعریف ہوتی نہ ناحق تنقیص۔ مولانا کا حافظہ اتنا قوی تھا (اور خدا کرے اب تک ایسا ہی ہو) کہ واقعات کی جزئیات اس طرح بیان کئے جاتے جیسے کتاب پڑھ کر سنا رہے ہوں۔ یہ محفلیں درحقیقت ہماری درسگاہ تھیں ـــــ اور اب محسوس ہوتا ہے کہ حاصلِ زیست بھی۔

اسی دوران میں میری کتاب معارف القرآن کی پہلی جلد شائع ہوئی جس کا مقدمہ مولانا نے (بکمالِ عنایت) خود تحریر فرمایا۔ اس کے بعد اس کی دوسری اور تیسری جلد بھی وہیں شائع ہوئی۔ قرآنی تحقیق کے اس تمام دشوار گذار مراحل میں مولانا کی رفاقت اور شفقت میرے لئے ہر مقام پر وجہِ تقویت رہی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اسے ان کی طرف سے حوصلہ افزائی کہوں یا غایتِ شفقت کہ جب لوگ ان کے پاس قرآنی مطالب سمجھنے کے لئے آتے تو آپ انھیں میرے پاس بھیج دیتے۔ ایسا بھی ہوتا کہ میری موجودگی میں لوگ ان کے پاس آتے تو آپ میری طرف اشارہ کر دیتے۔ میں نے کئی مرتبہ عرض کیا کہ آپ کی موجودگی میں مجھے لب کشائی کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ ایک مرتبہ میرے زیادہ اصرار پر فرمایا کہ قرآن کو بہتر طور پر سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ انسان کے سامنے اپنے زمانے کے تقاضے ہوں۔ تم اس دور کے تقاضوں کو بہتر سمجھتے ہو، اسی لئے قرآن کو سمجھ بھی سکتے ہو اور سمجھا بھی۔ اس لئے یہ فریضہ اب تمہیں ہی ادا کرنا ہوگا۔ آپ غور فرمایئے کہ اس قسم کی کشادہ ظرفی، وسعتِ قلب اور بلند نگہی، قرآن کے علاوہ اور کونسی چیز پیدا کر سکتی ہے؟ اتنا ہی نہیں۔ کئی مسائل ایسے بھی آجاتے جن میں مجھے ان سے اختلاف ہوتا۔ وہ ان مقامات پر مجھے ٹوکتے لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ انھوں نے اپنے خیال کو مجھ پر زبردستی ٹھونسنے کی کوشش کی ہو۔ وہ دلائل و براہین سے مجھے سمجھانے کی کوشش فرماتے لیکن اگر اس کے باوجود میں کہہ دیتا کہ میرا اس سے اطمینان نہیں ہوا تو ماتھے کی شکن تو ایک طرف دل کی گہرائیوں میں بھی اس کے متعلق کسی قسم کی کبیدگی پیدا نہ ہوتی۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ ان کی موجودگی میں کسی نے مجھ سے کسی ایسی بات کے متعلق پوچھا جس میں ان کا خیال مجھ سے مختلف تھا۔ میں نے اپنے خیال کے مطابق بات سمجھانی شروع کر دی۔ مولانا نہایت خاموشی سے سنتے رہے اور حقہ پیتے رہے۔ کبھی مداخلت نہیں کی۔ لیکن جب میں مستفسر سے کہہ دیتا کہ اس باب میں مولانا کا خیال کچھ اور ہے اور وہ ان کی طرف رجوع کرتا تو پھر آپ پوری وضاحت سے اپنے خیال کو پیش کرتے۔

مولانا سے اخذِ فیض کا یہ حسین و سادہ و رنگین سلسلہ اسی طرح جاری تھا کہ تقسیمِ ہند کا زمانہ آگیا۔ میں (اور اس حلقہ کے دیگر احباب) اُس زمانے سے "پاکستانی" واقع ہوئے تھے جب (۱۹۳۰ء میں) علامہ اقبال نے اپنے الہ آباد کے خطبۂ صدارت میں اس کی طرف اشارہ کیا تھا۔ لہذا ہمارے لئے تشکیلِ پاکستان جن مسرتوں اور شادمانیوں کا موجب ہو سکتی تھی وہ ظاہر ہے۔ لیکن اس ہجومِ مسرت میں یہ خیال ہم سب کے لئے وجہ ہزار اضطراب تھا کہ مولانا پاکستان نہ جا سکیں گے۔ اس خیال سے بالخصوص جو کچھ میرے دل پر گذرتی تھی اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بہرحال، یہ افرادِ کارواں خون کی ندیاں پیرتے اور آگ کی خندقیں پھاندتے کسی نہ کسی طرح پاکستان پہنچ گئے لیکن مولانا وہیں رہ گئے۔ اتنے برسوں کے بعد، مولانا سے اس طرح علیحدگی کا یہ پہلا موقعہ تھا اس لئے مجھے ان کی کمی ہر سانس میں محسوس ہو رہی تھی۔ مولانا نے میرے اس اضطراب کو محسوس فرمایا اور (ان کا کرم ملاحظہ فرمائیے کہ) تھوڑے ہی عرصہ کے بعد وہ میرے پاس (کراچی) تشریف لے آئے اور اس طرح پھر سے میرے گھر کی تاریکیاں، نور سے بدل گئیں اور دلّی کی محفلیں پھر سے تازہ و سرسبز ہو گئیں۔ لیکن مولانا کا یہ آنا عارضی تھا۔ اسلئے کچھ عرصہ کے بعد وہ واپس تشریف لے گئے۔

اس کے بعد میں اب تک اسی امید میں دن گذار رہا ہوں کہ شاید کبھی حالات مساعد ہو جائیں اور مجھے اس چشمۂ علوم و معارف سے، اتنے عرصہ کی تشنہ کامی کا صلہ مل جائے اگرچہ اس باب میں مولانا کے جوابات ابھی تک حوصلہ شکن ہیں۔ چنانچہ ان کا حالیہ خط موصول ہوا ہے [جو میرے اس خط کے جواب میں تھا جس میں میں نے ضمناً ذکر کیا تھا کہ بعض احباب کے تقاضے پر میں آپ سے اپنے روابط کے متعلق کچھ لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں] اس میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

ان عنایۃ ترنج سلسلے آپکو بجز ؛ دہرائے جس میں
آپ نے حدیث اور تفسیر قرآن کے متعلق اتنا کچھ سمجھ لیا کہ مجھ سے بھی آگے
نکل گئے ہیں۔ بلکہ کبھی کبھی مجھے دامن پکڑ کے پیچھے کھینچنا پڑا۔
مسلم آپ سا کارکن ... اس وقت ہی ایک دل ... صدارت کر رہا تھا ...
...... ہیں۔ اللہ نے ہی آپکے شریف عنایات پہنچایا۔ مگر
میں تو ایک بار پہلے ہی آپ کو لکھ چکا ہوں کہ وہ قطرۂ گوہر بنے گا جو ہر کار خیر میں
میرا اب سال کیسی کے سفر کی اجازت نہیں دیتی سوائے ایک سفر کے۔
محمد اسلم ـــ جامعہ نگر ـــ دہلی

بایں ہمہ، میں مایوس نہیں ہوں۔

یہ ہے مولانا سے میرے روابط کی داستان، جسے میں نے بعض احباب کے تقاضا پر مختصر الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ باقی رہے خود مولانا تو ان کے متعلق اگر آپ مجھ سے دو لفظوں میں پوچھنا چاہیں تو میں بلا تامل کہہ دوں گا کہ اس وقت میری نگاہوں کے سامنے کوئی دوسرا شخص ایسا نہیں جس کے افکار و کردار، دونوں میں قرآن اس وسعت اور گہرائی سے سمایا ہوا ہو۔ اللہ تعالیٰ انھیں تا دیر سلامت رکھے کہ

نورِ قرآں درمیانِ سینہ اش
جامِ جم شرمندۂ آئینہ اش

ایجنٹوں کے نام

ہر مہینے کے پہلے ہفتے میں پرچے بذریعہ وی۔ پی بھیجے جایا کریں گے۔ اور مہینے بھر کے پرچوں کی قیمت وصول کرلی جایا کرے گی۔ باقی تین ہفتوں کے پرچے عام ڈاک سے پوسٹل سرٹیفکیٹ لے کر ارسال کئے جایا کریں گے۔ رجسٹری منگوانے کی صورت میں خرچ بذمہ ایجنٹ ہوگا۔

کمیشن ۱۔ ۲ سے ۱۰ پرچوں تک کے لئے ۲۰ فی صدی۔ ۱۱ سے ۲۰ پرچوں تک کے لئے ۲۵ فی صدی۔ ۲۱ سے ۴۰ پرچوں تک کے لئے ۳۳ فی صدی۔ ۴۰ سے زائد پرچوں کے لئے ۴۰ فی صدی کمیشن دیا جائے گا۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳، کراچی

مطبوعات طلوعِ اسلام کی شرائط ایجنسی

شرح کمیشن | معراجِ انسانیت ـــ ۲۵ فی صدی۔ دیگر مطبوعات ـــ ۳۳ فی صدی

(۲) قیمت بعد وضع کمیشن بذریعہ وی پی وصول کی جائے گی۔ (۳) غیر فروخت شدہ کتب واپس نہیں لی جائیں گی (۴) پہلی فرمائش پچاس روپے (بعد وضع کمیشن) سے کم کی نہیں ہونی چاہیئے۔ (۵) ہر آرڈر کے ہمراہ کم سے کم چوتھائی رقم پیشگی آنی چاہیئے۔ ورنہ تعمیل نہیں ہو سکے گی

نوٹ:۔ کراچی کے ایجنٹ صاحبان دفتر طلوعِ اسلام سے شرائط طے کریں۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳، کراچی

ماہنامہ طلوعِ اسلام کے پرانے پرچے

۱۹۳۸ء سے لے کر جنوری ۱۹۵۵ء تک کے بعض پرچے دفتر میں موجود ہیں۔ جو بزمہائے طلوعِ اسلام کو چوتھائی قیمت پر اور دیگر اصحاب کو آدھی قیمت پر دیدیئے جائیں گے۔ اس رعایت سے ۳۰ اپریل تک فائدہ اٹھایا جا سکے گا۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳، کراچی

مشرقی پاکستان

متحدہ محاذ کی موجودہ کش مکش کا پس منظر

ان دنوں اخبارات میں مشرقی پاکستان کی سیاسی جماعت متحدہ محاذ یا جگتو فرنٹ کی باہمی کش مکش کے متعلق بہت کچھ لکھا جا رہا ہے لیکن اس کشمکش کا صحیح تصور ذہن میں نہیں آ سکتا جب تک ان کے اختلافات کا پس منظر سامنے نہ ہو۔ اس مقصد کے پیش نظر ہم اس پس منظر کے نمایاں خطوط سامنے لاتے ہیں۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ متحدہ محاذ کا وجود کسی منافرت اور منفی قدروں پر عمل میں آیا ہے۔ یہ جماعت صرف مسلم لیگ کو الیکشن میں شکست دینے کے لئے وجود میں آئی تھی جب الیکشن ختم ہو گیا تو اب ان کے پاس کوئی ایسا نقطۂ اتحاد ہی باقی نہ رہا جو اس جماعت کی شیرازہ بندی کو باقی رکھ سکتا۔ چنانچہ الیکشن کے بعد ہی جب وزارت بنانے کا موقع آیا تو اس وقت متحدہ محاذ میں شریک ہونے والی جماعتوں میں انتشار اور اختلال پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا۔

متحدہ محاذ کے قائد مولوی فضل الحق نے بڑی ہوشیاری اور دور اندیشی سے کام لے کر ہر اس شخص کو وزارت کی پیشکش کی جس کے متعلق انہیں خدشہ تھا کہ وہ آگے چل کر ان کی وزارت کے لئے خطرہ ثابت ہوگا۔ چنانچہ قارئین کو یاد ہوگا کہ جب فضل الحق کی وزارت کو برطرف کیا گیا تھا تو اس وقت ان کے وزراء کی تعداد ۱۴ تک پہنچ چکی تھی۔ وزراء کے علاوہ فضل الحق صاحب نائب وزراء اور پارلیمنٹری سکریٹری کی بھی ایک بہت بڑی فوج تیار کرنا چاہتے تھے لیکن قبل اس کے کہ ان کی یہ آرزو پوری ہو ان کی وزارت ہی اللہ کو پیاری ہو گئی۔

متحدہ محاذ کی تخلیق وزارت بناتے وقت فضل الحق صاحب نے نہایت سادگی و پرکاری سے یہ چیز بھی پیش نظر رکھی تھی کہ وزارت میں ان ایسے لوگوں کو شامل کیا جائے جو شروع سے ان کے ساتھ تھے۔ یا اگر وقت پڑے تو وہ ان کی مخالفت نہ کرتے۔ فضل الحق صاحب کو یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ مشرقی بنگال میں سب سے پہلے عوامی لیگ ہی نے مسلم لیگ سے ٹکر لی۔ اور یہی جماعت تھی جس نے باضابطہ حزب اختلاف کی حیثیت سے صوبے بھر میں ہر جگہ اپنے دفتر کھولے اور عہدیدار چنے۔ نیز یہی جماعت تھی جو الیکشن سے پہلے پورے صوبے میں ایک منظم حزب مخالف کی حیثیت رکھتی تھی اس جماعت کے قائد عبد الحمید خاں بھاشانی تھے مسٹر سہروردی بھی کبھی کبھار مشرقی بنگال جا کر عوامی لیگ والوں کی حمایت میں دو چار تقریریں کر آتے تھے۔ صوبے کے عوام نے مسلم لیگ یا عوامی لیگ کے علاوہ کسی اور سیاسی جماعت کا نام تک بھی نہیں سنا تھا عین الیکشن کے زمانہ میں فضل الحق صاحب نے اپنی پرانی عادت کے مطابق ایک جماعت کرشک سرمک پارٹی (کسان مزدور پارٹی) کے قیام کا اعلان کر دیا اور خود اس جماعت کے صدر بن بیٹھے۔ اور الیکشن کے لئے اس نئی پارٹی کے بہت سے ممبر نامزد کر دیئے۔ مسلم لیگ کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کے لئے حمید الحق چودھری صاحب، فضل حق صاحب اور سہروردی صاحب وغیرہ نے ایک متحدہ محاذ بنانے کی اسکیم بنائی جو باوجود بعض بنیادی اختلافات کے عمل میں آ گئی چونکہ وقت بہت تھوڑا تھا اور کام بہت زیادہ۔ اس لئے متحدہ محاذ میں شریک ہونے والی کسی جماعت نے اپنے ذاتی مطالبوں اور اپنے جماعتی اصولوں کی طرف توجہ نہ دی اور الیکشن میں متحد و متفق ہو کر مسلم لیگ کو عبرتناک شکست دیدی۔

تقسیم غنیمت اس فتح کے بعد جب وزارت بننے کا سوال سامنے آیا تو متحدہ محاذ میں شریک ہونے والی ہر جماعت نے اپنا حصہ مانگا لیکن فضل الحق صاحب نے بڑی خوبصورتی سے اکثر لوگوں کو مطمئن کرنے کے بعد کسی نہ کسی طرح وزارت بنا لی جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے متحدہ محاذ میں جماعتی حیثیت سے سب سے بڑی اکثریت عوامی مسلم لیگ کے ممبروں کی تھی جس کے سربراہ مولانا بھاشانی تھے۔ الیکشن ختم ہونے کے فوراً بعد مولانا بھاشانی امن کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن روانہ ہو گئے۔ اور عوامی لیگ کی ساری ذمہ داری عوامی لیگ کے نائب صدر عطاء الرحمن صاحب کے سر پڑی۔ فضل الحق نے وزارت بناتے وقت عطاء الرحمن کو نظر انداز کرنا چاہا تھا۔ مگر وہ ایسا کرنے پر قادر نہ ہو سکے۔ فضل الحق وزارت کی برطرفی کے بعد عوامی لیگ والوں نے عطاء الرحمن صاحب کی سرکردگی میں فضل الحق صاحب کے خلاف آواز بلند کی۔ اس جماعت کا یہ کہنا تھا کہ ملک میں حزب اختلاف کی بنیاد تو ہم نے ڈالی اور الیکشن ہماری کوششوں سے جیتا گیا۔ پھر فضل الحق صاحب کو وزارت بنانے کا حق کہاں سے پہنچتا ہے۔ اس کے علاوہ عوامی لیگ والوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ چونکہ فضل الحق صاحب ہی کے غیر ذمہ دارانہ بیانات کی وجہ سے وزارت معطل کی گئی تھی اس لئے اب ان کو تشکیل وزارت کا دوبارہ موقع نہیں دینا چاہیئے۔ پہلے تو اختلافات اندر ہی اندر چلتے رہے لیکن گورنر جنرل کے استقبال کے موقع پر یہ دو استقبالی کمیٹیوں کی شکل میں کھل کر لوگوں کے سامنے آ گئے۔ بایں ہمہ عین وقت پر لوگوں نے فضل الحق صاحب اور عطاء الرحمن صاحب میں صلح کرا دی۔ بظاہر یہ معلوم ہونے لگا کہ اختلافات اب ختم ہو گئے ہیں لیکن ان کی آگ اندر ہی اندر سلگتی رہی اور پرسکون سطح کے نیچے ایک جوالا مکھی تیار ہوتا رہا۔ یہ جوالا مکھی ۲ فروری کو پورے زور سے ڈھاکہ کی اسمبلی میں پھٹا۔ اور اس نے اپنی شعلہ فشانیوں سے دونوں لڑنے والے لیڈر یعنی فضل الحق صاحب اور عطاء الرحمن صاحب کے وقار کو جھلس کر رکھ دیا۔ ۲ فروری کو متحدہ محاذ کے ان دونوں لیڈروں کے اختلافات کے بعد جو حالات پیدا ہو گئے ہیں اس نے عوام کو ایک عجیب کشمکش میں ڈال دیا ہے۔ اب عوام کو نہ فضل الحق پر اعتماد ہے اور نہ عطاء الرحمن صاحب پر۔ وہ بے چارے حیران ہیں اور کسی خوش آیند مستقبل کے انتظار میں سرگرداں۔ دیکھئے یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو اتحاد اصولی جامعیت کی پختہ بنیادوں کے بجائے مفاد پرستیوں کی ریت پر استوار ہو جائے اس کا انجام یہی کچھ ہوا کرتا ہے۔ کیسی پُر عبرت ہے یہ تصویر اور کیسی تاسف انگیز ہے مسلمان قائدین کی یہ ذہنیت!

فردوسِ گم گشتہ

فردوسِ گم گشتہ قارئین طلوع اسلام یہ سن کر خوش ہوں گے کہ "فردوس گم گشتہ" (محترم پرویز صاحب کے مضامین کا مجموعہ) چھپ کر تیار ہو چکی ہے۔ اور اس کی ترسیل امروز و فردا میں شروع ہو جائے گی۔ یوں تو اس مجموعۂ مضامین کے تعارف کے لئے پرویز صاحب کا اسم گرامی ہی کافی ہے لیکن ہم قارئین کی واقفیت کے لئے اس کی فہرست مشمولات ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

دنیا کی نجات	تمسک بالکتاب	نظریۂ ارتقا	عقائد
جنگ	کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟	نجات	عالم اسلامی پیغام کی حقیقت
فردوس گم گشتہ	وراثت ارض کا ابدی قانون	ثواب	عید الضحیٰ
ایمان بالغیب	مسلمان کی زندگی	زکوٰۃ	لیلۃ القدر
اسلام اور سائنس	اپنی آنکھ اور قرآن کی روشنی	میثاق خداوندی	روزوں کی عید
خدا کی بادشاہت	نسخہ اور اس کا استعمال	ایک نورانی صبح	رحمت للعالمین
اسلام اور مذہبی رواداری	عبادت	اور رسول سے ملاقات	معراج

اسلوب نگارش کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔

" جاڑے کی کپکپاتی رات ہے کرزن روڈ (نئی دہلی) پر وسیع پائیں باغ کے اندر ایک حریری قصر رزیں کے بند روشندان کے شیشے سے بجلی لیپ کی شعاعیں حسن بے پرواہ کی بیتابی نمائش کی غمازی کر رہی ہیں۔ کمرہ ایرانی قالینوں، نرگسی صوفوں اور حریر و اطلس کے زرنگار پردوں سے دامان باغباں و کف گلفروش کی یاد تازہ کر رہا ہے ساقی بجلوۂ دشمن ایمان و آگہی مطرب بنغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے۔ بلوریں ساغروں کی کھنک، در آتش سیال کی دمک، یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے۔ آتش دانوں میں کوئلہ دہک رہا ہے جس کے شعلے ابھر ابھر کر اس جہان رنگ و نغمہ کو جھانکتے ہیں لیکن سرخی غازہ اور لعل و یاقوت صہبا کے سامنے ماند پڑ کر آتش حسد سے جل بجھتے ہیں۔ کیف و سرور کی اس دنیا میں کسی کسی کا ہوش نہیں اس لئے کہ یہ سب "انسان" ہیں۔ انہیں اس پر اختیار ہے کہ جب جی چاہے فطرت کے عطیہ عظمیٰ، امتیاز انسانیت، یعنی عقل و ہوش کو کھو دیں لیکن جماد و نباتات کو یہ اختیار حاصل نہیں۔ پتھر کا کوئلہ اپنے فریضہ منصبی کی سرانجام دہی میں انتہائی جذب و انہماک سے سرگرم عمل ہے۔ وہ اس فضا کی ہوش ربا رنگینیوں سے متاثر نہیں وہ اپنی گیس کو برابر ہوا میں ملاتا جا رہا ہے۔ دروازے، کھڑکیاں، روشن دان سب بند ہیں۔ کمرے کی ہوا آہستہ آہستہ غیر محسوس طور پر مسموم ہوتی جا رہی ہے حتیٰ کہ دم گھٹنے کی نوبت آ پہنچی جو بالکل مدہوش اور خود فراموش ہیں انہیں تو فطرت کی یہ تنبیہ بھی نہیں چونکا سکتی لیکن جن میں ابھی کچھ شعور باقی ہے انہیں فضا کی سمیت کا احساس ہوا کوئی بے تابانہ دروازے کی طرف لپکا۔ کوئی کھڑکی کی طرف بھاگا اس وقت نہ ساقی کا ناز خرام ان کی راہ میں حائل ہوا نہ نغمہ کی دلکشی دامنگیر، نہ کسی کو صراحی ٹوٹ جانے کی پرواہ ہے نہ پیمانے کے لڑھکنے کا احساس اس وقت تمام توجہات دروازوں اور کھڑکیوں پر مرکوز ہیں۔ باہر کس قدر سردی ہے اس کا کسی کو خیال نہیں ہر ایک کی کوشش ہے کہ کسی طرح وہ سب سے پہلے باہر نکل جائے۔ اس افراتفری میں چٹخنیاں بھی نہیں کھلتیں اس نفسا نفسی میں ایک دوسرے کو دھکے دے کر روندنے اور مسلنے تک سے بھی گریز نہیں کیا گیا۔"

فردوس گم گشتہ کی ضخامت ۲۱۶ صفحات ہے اور قیمت ۴ روپے معاونین کے نام یہ کتاب ایک ہفتہ کے اندر اندر روانہ کر دی جائے گی۔ البتہ ... (پرویز)

بین الاقوامی جائزہ

پاکستان کا ایک قدم مشرقِ وسطیٰ میں ہے اور دوسرا جنوب مشرقی ایشیا میں۔ نتیجۃً یہ ضروری ہے کہ پاکستان نہ محض دونوں علاقوں کے کوائف میں گہری دلچسپی لے بلکہ جو عالمگیر قوتیں ان کی تشکیل کی ذمہ دار ہیں ان سے بطریقِ احسن عہدہ برآ ہو۔

اس اعتبار سے ۱۹۵۵ء بڑا اہم سال ہے کیونکہ اس کے شروع میں پاکستان نے ترکی سے معاہدہ کر کے شرقِ وسطیٰ کی دفاعی تنظیم کا سنگِ بنیاد رکھا۔ اور اس کے اواخر میں منیلا میں سات دیگر اقوام سے مل کر معاہدہ سیٹو پر دستخط کئے جس کا مقصد ایک قسم کی ایشیائی "ناٹو" قایم کرنا ہے۔

یہ معاہدہ تصدیق کے جملہ مراحل سے گذر کر ۱۹ فروری سے نافذ العمل ہو چکا ہے کیونکہ اس تاریخ کو آٹھ دستخط کرنے والی اقوام نے دستاویزِ تصدیق داخل کئے۔ ۲۳ فروری کو اس سلسلہ کا دوسرا قدم یوں اٹھایا گیا کہ بنکاک یعنی تھائی لینڈ (سیام) کے دارالحکومت میں سیٹو کونسل کا اجلاس طلب کیا گیا۔ اس کونسل نے فیصلہ کیا ہے کہ بنکاک سیٹو کا مستقل مرکز ہو گا اور ایک بین الاقوامی سکریٹریٹ قایم کیا جائے گا جس کے تین شعبے ہوں گے۔ شعبہ عسکری۔ تمام ارکان ممالک کا دورہ کر کے مقامی دفاع کی منصوبہ بندی بھی کرے گا۔ اور علاقہ بھر کی مجموعی دفاع کی بھی۔ دوسرا گروہ داخلی تخریبی تحریکوں کی روک تھام کی تدابیر سوچے گا۔ یہ تخریبی تحریکیں ایشیائی ممالک میں خصوصیت سے سرابھار رہی ہیں۔ ان کی واقعی روک تھام کر لی گئی تو متعلقہ ممالک اطمینان کا سانس لے سکیں گے اور اپنے بیشتر ذرائع تعمیر و ترقی کی راہ میں استعمال کر سکیں گے۔ تیسرا اہم ترین شعبہ امداد سے متعلق ہو گا۔ ایشیائی اقوام کی پسماندگی اظہر من الشمس ہے اور یہی ان کے امراض کی علت العلل ہے۔ اس کا مداوا معاشی امداد ہے۔ جب تک یہ علاقے غریب رہیں گے ان میں تخریبی قوتیں ابھرتی ہی رہیں گی۔ ستمبر ۱۹۵۴ء میں معاہدہ سیٹو پر دستخط کرتے وقت۔ کاہل منشور (PACIFIC CHARTER) بھی تیار کیا گیا تھا۔ جو معاشی امداد سے متعلق تھا۔ کونسل کے اجلاس میں معاشی امداد پر خصوصی زور دیا گیا اس میں پیش پیش پاکستانی وزیر اعظم تھے۔ گو معاشی امداد کا اصول تسلیم کر لیا گیا ہے لیکن اسے موثر طریق سے منظم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ امریکی سکریٹری آف اسٹیٹ مسٹر ڈیلز نے تو یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس امداد کو مختلف ممالک کے مابین دو طرفہ معاہدوں اور منصوبہ کولمبو تک محدود رہنے دیا جائے۔ گو اس وقت پاکستان اور دیگر ضرورت مند ممالک کو امریکہ اور دیگر امیر ممالک سے مدد مل رہی ہے۔ اور اس کے ملتے رہنے کا امکان ہے۔ لیکن سیٹو کے ارکان اور غیر ارکان میں کچھ تو تمیز روا رکھنی چاہیئے تھی۔ امداد کی موجودہ صورتوں سے وہ ممالک بھی فائدہ اٹھا رہے ہیں جنہوں نے ان مصلحتوں کے تحت سیٹو میں شامل ہونا روا نہیں رکھا۔

سیٹو کونسل کا جلسہ سال میں ایک مرتبہ ضرور ہو گا۔ اور ضرورت کے مطابق زیادہ مرتبہ بھی اجلاس طلب کئے جا سکتے ہیں جس کے فیصلے متفقہ ہوں گے۔ معاہدہ ممالک کے فوجی مشیر بھی وقتاً فوقتاً صلاح مشورے کے لئے ملتے رہیں گے۔

اس اجلاس کو فارموسا کے پس منظر میں دیکھا جائے تو اس کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے ایک تو اس لئے کہ ایسے اجلاس اور ان کے فیصلے اشتراکی جارحیت کے لئے انتباہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ اشتراکی چین اس پر بہت چیں بجبیں ہوا ہے۔ اور اس نے امریکہ کو جنگی تیاریاں کرنے پر بہت سخت سست کہا ہے۔ دوسرے اس لئے اس کونسل کے سلسلہ میں ڈیلز اور ایڈن کی ملاقات بھی ہو گئی۔ جس کی برطانوی امریکی اختلافات کے پیشِ نظر بڑی ضرورت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ اختلافات تمام و کمال رفع نہیں ہو سکے۔ اور مسٹر ڈیلز ایڈن کے پوری طرح ہم خیال نہیں بن سکے۔ یہ بات ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن امریکہ سے اختلاف رکھنے کی بدولت برطانیہ فارموسا کے قضیئے کو حل کرنے کے اور زیادہ قابل ہو گیا ہے۔ اور اس سے یہ امید بندھ چلی ہے کہ فارموسا سے متعلق التوائے جنگ کی صورت نکل آئیگی۔ یہ صورت یہی ہے کہ اگر کیمائے اور مٹسو جزائر خالی کر دیئے گئے تو چین ہاتھ روک لے گا اور جنگ کا التوا خود بخود ہو جائے گا۔ یہ امید اس لئے قایم کی جا رہی ہے کہ چین امریکہ سے جنگ مول لینے کے لئے بالکل تیار نہیں وہ بہر حال مفاہمت کی کوئی صورت نکالے گا۔ ویسے فارموسا کی نیشنلسٹ حکومت نے تاچین کے بعد ایک اور جزیرہ تاچی خالی کر دیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی کیمائے اور مٹسو وغیرہ جزائر کو حکم دیا ہے کہ "لڑو اور مرو" کا فیصلہ کریں۔ بعض حلقوں میں اس کی یہ توجیہ کی جا رہی ہے کہ نیشنلسٹ چین اعلاناً مقابلہ اور عدمِ تخلیہ کا کر دیگا۔ لیکن عملاً تبدریج ان جزائر کو خالی کرتا جائے گا فارموسا سے متعلق ایک دلچسپ تجویز سامنے آتی ہے۔ برما کے وزیر اعظم او نو نے انکشاف کیا ہے کہ اشتراکی چین نے ان کی وساطت سے مسٹر ڈیلز کو یہ پیغام بھجوایا ہے کہ وہ پیکن میں امریکی نمایندے سے عالمی مسائل پر گفتگو کے لئے تیار ہے۔ روس نے بھی غالباً پنج ملکی قومی کانفرنس کی تجویز میں کچھ ترمیمات کی ہیں۔ ان اطلاعات سے مترشح ہوتا ہے کہ روس و چین مفاہمت کی راہیں تلاش

حقائق و عبر

یوں بھی اور یوں بھی

ایک دعویٰ:

"ہر وہ بات جس پر نطقِ رسول کا اطلاق کیا جا سکتا ہے آیاتِ مذکورہ کی بناء پر وحی ہوئی۔ ...... یہ تصریح قرآن میں اس لئے کی گئی ہے کہ رسول کو جن لوگوں کے پاس بھیجا گیا ہو ...... وہ جان لیں کہ رسول کی ہر بات خدا کی طرف سے ہے"۔

دوسرا دعویٰ:

"ان امور کے متعلق جو باتیں حضور سے احادیث میں منقول ہیں ان کا اختلافِ مضمون خود بھی ظاہر کرتا ہے اور حضور کے طرزِ قدم سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ وہ آپنے برنبائے وحی نہیں بلکہ برنبائے ظن و قیاس ارشاد فرمائی ہیں"۔

آپ کہتے ہوں گے کہ یہ دعاوی دو مختلف اشخاص کے ہیں جو رسول اللہ کی حیثیت کے متعلق دو بالکل متضاد تصور رکھتے ہیں اور ایک دوسرے سے مناظرہ کر رہے ہیں۔ لیکن آپ کی یہ بھول ہے۔ یہ دونوں قول ایک ہی شخص کے ہیں۔ اور وہ شخصیت ہے جماعتِ اسلامی کے امیر جناب سید ابو الاعلیٰ صاحب مودودی کی۔ پہلا قول تفہیمات حصہ اول ص ۲۳۲-۲۴۳ پر ہے اور دوسرا ترجمان القرآن بابت فروری ۱۹۵۵ء کے ص ۳۶۰ پر۔

اور اس کے باوجود وہ علم اور شریعت کے میدان میں دورِ حاضرہ کی سب سے بڑی شخصیت بھی ہیں۔ جب انسانوں کی آنکھ پر عقیدت کی پٹی باندھ دی جاتی ہے تو اس کے بعد ان سے سب کچھ منوایا جا سکتا ہے۔ "پیری مریدی" بھی کیسے نئے نئے بھیس بدل کر سامنے آتی رہتی ہے۔ اگرچہ پیرِ آدم جواں ہیں لات و منات

ایک ہی سرچشمے سے

خلافتِ راشدہ کے بعد "جاہلیتِ خالصہ نے حکومت اور دولت پر تسلط جمایا .... ی شاہی کی سرپرستی میں امراء، حکام، ولاۃ، اصل لشکر اور مترفین کی زندگیوں میں کم و بیش خالص جاہلیت کا نقطۂ نظر پھیل گیا۔ اور اس نے اخلاق و معاشرت کو پوری طرح ماؤف کر دیا ...... یونان اور عجم کے فلسفے اور علوم و آداب نے اس سوسائٹی میں راہ پائی۔ جو اسلام کی طرف منسوب تھی۔ اس پر بس نہیں۔ بلکہ رقص، موسیقی اور تصویر کشی جیسے خالص جاہلی آرٹ از سرِ نو ان قوموں میں بار پانے لگے جن کو اسلام نے ان فتنوں سے بچا لیا تھا ..... جاہلیت مشرکانہ نے عوام پر حملہ کیا۔ اور توحید کے راستے سے ہٹا کر ان کو ضلالت کی بے شمار راہوں میں بھٹکا دیا ...... جاہلیت راہبانہ نے علماء، مشایخ، زہاد اور پاکباز لوگوں پر حملہ کیا اور ان میں وہ خرابیاں پھیلانی شروع کر دیں جن کی طرف میں اس سے پہلے اشارہ کر چکا ہوں۔ اس جاہلیت کے اثر سے اشراقی فلسفہ، راہبانہ اخلاقیات اور زندگی کے ہر پہلو میں مایوسانہ نقطۂ نظر مسلم سوسائٹی میں پھیلا۔ اور اس نے صرف یہ کہ ادبیات اور علوم کو متاثر کیا بلکہ فی الواقعہ سوسائٹی کے اچھے عناصر کو مدقیا کا انجکشن دے کر سست کر دیا۔ پادشاہی کے جاہلی نظام کو مضبوط کیا۔ اسلامی علوم و فنون میں جمود اور تنگ خیالی پیدا کی۔ اور ساری دینداری کو چند خاص مذہبی اعمال میں محدود کر کے رکھ دیا۔ (تجدید و احیاءِ دین)"

یہ ہے اسلام کے متعلق مودودی صاحب کا وہ مطالعہ جس کی رو سے انہوں نے بتایا ہے کہ کس طرح رسول اللہ کی وفات کے تھوڑے عرصہ بعد ہی جاہلیت کے مختلف عناصر اسلام کے مختلف گوشوں پر چھا گئے اور (بجز مستثنیات) پوری کی پوری امت ان سے متاثر ہو گئی۔ لیکن اس کے برعکس اب ان کے جانشین (نعیم صدیقی صاحب) فرماتے ہیں کہ

"اس لحاظ سے ہمارا اجتماعی ذہن ایک ایسا سمندر ثابت ہوا ہے جس کی داخلی رویں اور لہریں بیرونی تحریکوں پر ہمیشہ چھائی رہی ہیں۔ مثلاً روم و ایران کی تہذیبی برتری نے ہمارے اوپر اثر ڈالنا چاہا۔ لیکن ایک پیش نہ گئی۔ پھر یونان کا فلسفہ آگے بڑھا۔ لیکن بہت جلد اس کا زور ٹوٹ گیا۔ پھر عجمی تصوف نے حملہ کیا لیکن ہمارے اجتماعی ذہن نے اس کے مقابلہ میں بھی اپنی امتیازی ساخت کو بحال رکھا ... فکر و خیال کی دنیا میں جو معرکے ہماری تاریخ میں لڑے گئے ہیں اور پھر توڑ پھوڑ کے ہنگاموں کے بعد ہمارا اجتماعی ذہن جس طرح اپنی جگہ پر بار بار قایم ہو جاتا ہے۔ اس کا ریکارڈ ہمارا سوا ہزار سالہ علمی لٹریچر ہے۔ یہ لٹریچر ہماری بنیادی فکر کا پورا پورا جوہر شروع سے آخر تک اپنے اندر لئے چلا آ رہا ہے۔" (ترجمان القرآن۔ بابت فروری ۱۹۵۵ء۔ ص ۲۹۸)

(باقی ص ۱۸ پر)

اندرونِ ہند

۱۱، ۱۲، ۱۳، فروری ۱۹۵۵ء کو کلکتہ میں جمعیت علماء ہند کا اٹھارواں اجلاس منعقد ہوا جس میں ہندوستان کے چپہ چپہ کے علماء نے شرکت کی۔ اس سے پہلے بمبئی میں علماء کا ایک بڑا کنونشن جنوری میں منعقد ہو چکا ہے۔ ان دونوں کانفرنسوں کی رپورٹیں پڑھنے سے جہاں بھارت کی سیکولر حکومت کے بے پناہ اور لگاتار مظالم کا صحیح نقشہ سامنے آتا ہے وہیں اس سے یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اب بھارت کے مسلمان اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی انتھک کوشش کر رہے ہیں۔ اور بھارت میں مسلمانوں کے ساتھ جو برتاؤ کیا جا رہا ہے وہ سب اب کھلم کھلا جلسوں اور کانفرنسوں میں بیان کئے گئے ہیں۔ یہ آثار نیک ہیں اور ہمیں خوشی ہے کہ بھلے ان بھائیوں کے دل میں استحکامِ خویش کا جذبہ عمدگی سے ابھر رہا ہے۔ چنانچہ کلکتہ کے اجلاس میں جمعیت علماء کے ایک سرگرم کارکن اور بھارتی پارلیمنٹ کے رکن مولانا شاہد فاخری نے اپنی طویل تقریر میں کہا:

"آج ہم اپنے خدا کے سامنے عہد کرتے ہیں کہ مغربی بنگال کے اجڑے ہوئے مسلمانوں کو آباد کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کریں گے اور ان کی آبادکاری میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھیں گے۔ خواہ ہمیں اس کے لئے اپنا گھر اجڑوانا پڑے۔ ہمیں اپنا خون بہانا پڑے۔ ہم ہر قیمت پر ان کو آباد کر کے رہیں گے"۔ ....

"آج ہمارا یہ اعلان ہے کہ کر کے رہیں گے یا مر کے رہیں گے۔ ہم اس کی وضاحت کر دینا چاہتے ہیں کہ ہم کسی کے بھروسے پر نہیں جیتے ہیں۔ ہم نہ جواہر لال نہرو کے بھروسے پر جیتے ہیں اور نہ دنیا کی کسی طاقت کے بھروسے پر۔ ہم اگر جیتے ہیں تو اپنے ضمیر، اپنے ایمان، اور سب سے زیادہ اپنے خدا کے بھروسے پر جیتے ہیں۔ ہم اربابِ حکومت سے کہیں گے کہ کل تک تم نے ہمارے ساتھ بیڑیاں پہنی تھیں آج کرسیوں پر جا کر تم ہمیں بھول گئے ہو تو یاد رکھو کہ ہم تمہیں ان کرسیوں پر سے اتار بھی سکتے ہیں"۔ .....

مولانا شاہد فاخری نے اپنی تقریر میں آگے چل کر کہا:

"میں نے یہاں کی بہت سی گلیوں میں جا کر دیکھا ہے ہوئے دیکھے جنہیں دیکھ کر مجھے سبت ... پہنچا۔ اگر میں یہاں (مغربی بنگال) کے ایوان کا ممبر ہوتا تو آواز اٹھاتا۔ میں ایک ایسی جگہ (یوپی) سے آ رہا ہوں جہاں کی حکومت بددیانت ہے۔ جہاں کی ساری مشینری بگڑی ہوئی ہے۔ لیکن ہم اس سے بددل نہیں ہیں۔ ہم تمام مصائب کا مردانہ وار اور ہمت کے ساتھ مقابلہ کرنے کو تیار ہیں"۔

بھارت کا محکمہ آبادکاری مسلمانوں کے ساتھ جس قسم کا ظالمانہ برتاؤ کر رہا ہے اس کے متعلق ہم نے ... طلوعِ اسلام ... کے پچھلے شمارے میں بھارتی اخبارات کے حوالے سے کچھ واقعات نقل کئے تھے۔ بھارت کے محکمہ آبادکاری کی دھاندلیوں کے بارے میں پرجا سوشلسٹ پارٹی کے دو لیڈروں مسٹر رام سرن چوہان اور میر مشتاق احمد کا ایک طویل بیان بھارتی اخبارات میں شائع ہوا ہے جسے ہم ذیل میں پیش کر رہے ہیں۔

شاید ہی کسی ظالم نے ہندوستان کے غریب مسلمانوں کو اس قدر دبایا ہو جتنا کہ جابر اور متعصب کسٹوڈین کے محکمہ نے کیا ہے۔ بغیر کسی قسم کی تفتیش کے اس محکمہ نے متعدد مسلمانوں کی جائدادوں کو متروکہ قرار دے دیا۔ حالانکہ وہ کبھی پاکستان نہیں گئے۔ ان میں ایسے بھی مسلمان ہیں جو دہلی سے غازی آباد تک بھی نہیں گئے۔ جو صرف ۵ میل دور ہے .... اور تو اور جب مرحوم آصف علی امریکہ میں ہندوستان کے سفیر تھے تو اس محکمہ نے ان کے مکان پر بھی متروکہ کا نوٹس چسپاں کر دیا تھا۔ اتفاق سے مولانا آزاد کی کوئی جائداد دہلی میں نہیں ہے ورنہ وہ بھی متروکہ قرار دے دی جاتی۔ اور پھر مولانا کو ثابت کرنا پڑتا کہ سنہ ۱۹۴۷ء سے لے کر اب تک وہ ہر روز دہلی میں موجود رہے۔

بیان کے آخر میں حکومت ہند سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ مسلمانوں کو اس ظلم و تعدی سے بچائے۔

یہ ہے ہندوستان کی سیکولر حکومت!

مطبوعاتِ طلوعِ اسلام

معراجِ انسانیت — از پرویز۔ سیرت صاحبِ قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآن کے آئینے میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہبِ عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرورِ کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ بڑے سائز کے تقریباً نو سو صفحات اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ۔ مضبوط و حسین جلد مع گرد پوش۔ قیمت بیس روپے۔

ابلیس و آدم — از پرویز۔ سلسلہ معارف القرآن کی دوسری جلد جسے نظرِ ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ انسانی تخلیق۔ قصۂ آدم۔ ابلیس۔ جنات۔ ملائکہ۔ وحی وغیرہ جیسے اہم مباحث کی حامل۔ بڑی تقطیع کے ۳۷۲ صفحات۔ قیمت آٹھ روپے

قرآنی دستورِ پاکستان — اس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے اور حکومت علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے ۲۲۴ صفحات قیمت دو روپے آٹھ آنے

اسلامی نظام — اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ۱۲۰ صفحات قیمت دو روپے

سلیم کے نام — از پرویز۔ نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوئے ہیں ان کا شگفتہ مدلل اور اچھوتا جواب۔ بڑے سائز کے ۲۲۵ صفحات قیمت چھ روپے

قرآنی فیصلے — روزمرہ کی زندگی کے ساتھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن کی روشنی میں بحث ۴۰۰ صفحات قیمت چار روپے

اسبابِ زوالِ امت — از پرویز۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور علاج کیا۔ ۱۵۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

جشن نامے — ایسے عنوانات جنہیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو اور آنکھوں میں آنسو۔ طنز اور تنقید کے پہرے میں شہزادہ سات سالہ دورِ آزادی کی سمٹی ہوئی تاریخ۔ ۲۵۶ صفحات۔ قیمت ۲ روپے ۸ آنے

مزاج شناسِ رسول — یہ کون بتائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں اور غلط کونسی؟ مزاج شناسِ رسول! مزاج شناس کون ہیں؟ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ ۴۴۸ صفحات قیمت چار روپے

مقامِ حدیث — حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جواب۔ احادیث کے متعلق اتنی معلومات کسی جگہ یکجا نہیں ملیں گی۔ دو جلدیں۔ ہر جلد کے تقریباً چار سو صفحات اور قیمت فی جلد چار روپے

فردوسِ گم گشتہ — از پرویز۔ ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا۔ خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف۔ ۴۱۰ صفحات قیمت چھ روپے

نوادرات — از علامہ اسلم جیراجپوری۔ علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ۔ چار سو صفحات۔ قیمت چار روپے

اسلامی معاشرت — (از پرویز) مسلمان کے عادات و اخلاق کا خاکہ۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ۔ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر اسلوب قرآنی آئینہ میں۔ صفحات ۱۹۲ قیمت دو روپے

نوٹ

تمام کتابیں مجلد ہیں اور گرد پوش سے آراستہ۔ محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار۔

ملنے کا پتہ:-

ادارۂ طلوعِ اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳، کراچی

نقد و نظر

ثقافت لاہور میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب کی زیرنگرانی ادارہ ثقافت اسلامیہ (اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ) ایک عرصہ سے قائم ہے اس وقت تک ادارہ کی طرف سے صرف کتابیں شایع ہوتی تھیں اب انھوں نے "ثقافت" کے نام سے ایک ماہوار رسالہ بھی شایع کیا ہے جس کے دو نمبر (بابت جنوری فروری ۱۹۵۵ء) ہمیں موصول ہوئے ہیں۔ ادارۂ تحریر میں خلیفہ صاحب کے علاوہ محمد حنیف ندوی، محمد جعفر پھلواروی، مظہرالدین صدیقی، بشیر احمد ڈار، رئیس احمد جعفری اور شاہد حسین رزاقی کے اسمائے گرامی درج ہیں۔ ہمیں رزاقی صاحب کی کسی سابقہ تحریر دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ باقی حضرات میں سے ندوی صاحب، پھلواروی صاحب اور جعفری صاحب اچھا لکھنے والے ہیں اس لئے ان سے خوشگوار توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں اگرچہ ان دو شماروں میں حنیف ندوی کا مقالہ "رسالات امام غزالی کے حکایات" کچھ یا ہوا نظر آتا ہے۔ محترم جعفر شاہ صاحب کا مضمون "ازدواجی زندگی کے لئے اہم قانونی تجاویز" عمدہ ہے لیکن اس میں جو حصہ طلاق کے متعلق ہے وہ صاف نہیں۔ ایسا نظر آتا ہے کہ طلاق ثلاثہ کا قرآنی مفہوم جعفری صاحب کے سامنے واضح نہیں اس لئے وہ فقہ کی "تین طلاقوں" کی بحث میں الجھ گئے ہیں نیز انھوں نے "ابغض الحلال" کی جو توجیہہ بیان فرمائی ہے وہ کچھ دل لگتی بات نہیں۔ اور جس مثال سے اسے سمجھانے کی کوشش کی ہے وہ ذوق لطیف پر بڑی گراں گذرتی ہے۔

رسالہ کی ظاہری صورت دیدہ زیب ہے۔ سالانہ چندہ آٹھ روپے، فی پرچہ بارہ آنہ۔ ملنے کا پتہ: ادارۂ ثقافت اسلامیہ، ۲۔ کلب روڈ، لاہور۔

IRAQ TODAY شایع کردہ: ڈائرکٹر جنرل، پروپگنڈہ، وزارت داخلہ، حکومت عراق، بغداد۔ صفحات ایک سو

بین الاقوامی سیاست اور عالم اسلامی میں عراق کی اہمیت دن بدن بڑھتی جارہی ہے اور اس کا چرچا زیادہ ہوتا جارہا ہے۔ یہ اس کا ثبوت ہے کہ یہ ملک بھی دیگر ممالک اسلامیہ کی طرح روایتی غفلت اور بے عملی کو خیرباد کہہ کے ترقی یافتہ اقوام عالم کی صف میں اپنی جگہ بنانے کے لئے مصروف جد و جہد ہے۔ ملوکیت جسے عہد حاضر نے مردود و مطرود قرار دے دیا ہے وہ بدستور عراق میں بعض اور مسلم ممالک کی طرح موجود ہے۔ لیکن اس کے انداز وطن نواز اور قوم پرورانہ ہوتے جارہے ہیں۔ یہ پتہ ہے اس تبدیلی کا جو ان ممالک کے ضمیر میں پرورش پارہی ہے جس کے متعلق توقع کی جاسکتی ہے کہ رفتہ رفتہ زیادہ سے زیادہ تابناکی کے ساتھ ہوتی جائے گی۔ ان حالات میں یہ ضروری ہے کہ عراق جیسے ملک کے کوائف کو بالغ نظری سے دیکھا جائے اور ان رجحانات کا مطالعہ کیا جائے جو بتدریج ابھر رہے ہیں اور اس کی تقدیر کی تشکیل کررہے ہیں۔

عراق پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن اس کی حیثیت جغرافیائی یا تاریخی ہے۔ ضرورت تھی کہ اس ملک کی اس جد و جہد کا نقشہ پیش کیا جائے جو اسے ایک جدید مملکت بنانے کے سلسلے میں ہورہی ہے اس کی کمی ایک حد تک زیرنظر کتابچہ سے پوری ہوتی ہے۔ یہ کتاب یوں تو پروپگنڈہ کے ڈائرکٹر جنرل کی طرف سے شایع ہوئی ہے لیکن پیش لفظ میں بتایا گیا ہے کہ اس کا مقصد پروپگنڈہ نہیں۔ بلکہ عراق کی موجودہ حیات قومی سے متعلق معلومات بہم پہنچانا ہے۔ اور ان تعمیری مساعی کو واضح کرنا جو اس وقت عراق میں ہورہی ہیں۔ یہ کتاب مکمل نہیں کہلا سکتی لیکن "آج کا عراق" کی بہت حد تک جامع تصویر ضرور ہے۔ خود حکومت کی جانب سے ہونے کی وجہ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس میں تصویر کا ایک ہی رخ پیش کیا گیا ہوگا اور وہ بھی بہت ہی زیادہ روشن ہوگا۔ یہ شبہ صحیح ہو تو بھی اس میں عراق سے متعلق ایسی معلومات مل جاتی ہیں کہ آپ مناسب نتائج قائم کرسکتے ہیں۔

کتاب میں مختصراً شاہی خاندان کی بھی تاریخ ہے اور عراق کی قدیم تاریخ بھی۔ بہر نوع تعمیری، تعلیمی اور معاشی کوائف کا تذکرہ ہے۔ ایک باب مختلف افواج سے متعلق ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فوج کی تنظیم کیسے ہوئی اور وہ ملک میں کیا پارٹ ادا کررہی ہے۔

کتاب دبیز آرٹ پیپر پر بڑی خوبصورت چھپی ہے اور اس میں متعدد رنگین تصویریں ہیں۔ اخبارات وغیرہ کے لئے کتاب بطور حوالہ کے کام دے سکتی ہے اور عام قارئین بھی اس سے استفادہ کرسکتے ہیں۔

باب المراسلات

عنوانات طلوع اسلام ملتان سے ایک صاحب لکھتے ہیں:

"ہفتہ وار طلوع اسلام کا دوسرا شمارہ اس وقت میرے ہاتھ میں ہے۔ فہرست مضامین میں "طاہرہ کے نام" کی کمی کو اوروں کی طرح میں نے بھی محسوس کیا۔ میرے ملنے والوں میں چند حضرات طلوع اسلام صرف اس لئے پڑھتے ہیں کہ محترم پرویز صاحب عورتوں کے مسائل طاہرہ کے خط میں بڑے سلجھے ہوئے انداز میں بیان کرتے ہیں۔ میں نے مستورات کو بھی یہ مضمون بڑی دلچسپی سے پڑھتے دیکھا ہے۔ بہتر ہو کہ طاہرہ کے نام خطوط کا سلسلہ ہفتہ وار طلوع اسلام میں جاری رہے تاکہ زیادہ سے زیادہ افراد طلوع اسلام سے روشناس ہوتے رہیں۔"

طلوع اسلام: اگر "طاہرہ کے نام" یا بعض دیگر ایسے مضامین جو ماہنامہ طلوع اسلام کی خصوصیت تھے ہفتہ وار میں ابھی تک شایع نہیں ہوئے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ ماہنامہ سے مختص تھے۔ اور ہفتہ وار اس سے محروم رہے گا۔ قارئین بالکل یہ نہ سمجھیں کہ طلوع اسلام ہفتہ وار ہوکر ماہنامہ سے مختلف یا فروتر ہوگیا ہے، یا اب اس میں وہ مضامین شائع نہیں ہوسکیں گے جو ماہنامہ میں شائع ہوا کرتے تھے۔ ہفتہ وار ماہنامہ ہی کی دوسری شکل ہے اور یہ تبدیلی اس لئے کی گئی ہے کہ طلوع اسلام کا دامن اور وسیع ہوجائے۔ اور وہ زیادہ سے زیادہ موضوعات کا احاطہ کرکے اپنی آواز کو اور مؤثر بنا سکے۔ نہ اس لئے کہ اس کا دامن سمٹ جائے اور وہ اپنی سابقہ روایات سے ہٹ جائے۔ قارئین اس سلسلے میں پوری طرح مطمئن رہیں۔

جہاں تک کہ پرویز صاحب کی معاونت، ہدایت اور سرپرستی کا تعلق ہے ان سے اب طلوع اسلام پہلے سے بھی زیادہ بہرہ یاب ہوگا۔ کیونکہ جیسا کہ سابقہ اشاعت میں "کام کی رفتار" کے تحت لمعات میں بتایا گیا ہے۔ پرویز صاحب اب سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوچکے ہیں۔ یہ سبکدوشی قبل از وقت اور رضاکارانہ ہے اس غرض سے حاصل کی گئی ہے کہ آپ پوری دلجمی اور یکسوئی کے پیش نظر مقصد کی تکمیل میں کوشاں ہوسکیں۔ اور اس کے لئے اپنا سارا وقت دے سکیں۔ "طاہرہ کے نام" اور "سلیم کے نام" خطوط کا سلسلہ عنقریب شروع کردیا جائے گا اس طرح پرویز صاحب کے دیگر مضامین بھی شایع ہوتے رہیں گے۔ اگرچہ جو کچھ وہ طلوع اسلام کے لئے اب تک لکھتے چلے آرہے ہیں اور لکھ رہے ہیں وہ بھی کچھ کم نہیں۔

عوام سے متعلق یہی صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں:

"دوسری تجویز یہ ہے کہ ہر ہفتہ ایک مضمون عام فہم زبان پر کسی ایسے عنوان پر جس کا تعلق روزمرہ کی زندگی سے ہو جاری کیا جائے۔ تاکہ اس مضمون کو بطور خطبہ جمعہ کے روز پڑھا جاسکے۔ اس سے طلوع اسلام اور اس کے مسلک سے عوام کو باخبر رکھنے میں بڑی مدد ملے گی۔"

طلوع اسلام: وہ جو غالبؔ نے کہا تھا کہ "گلہ ہے شوق کو بھی دل میں تنگئ جا کا" سو یہی حالت طلوع اسلام کی ہے۔ ہم نے ماہنامہ کو ہفتہ وار کرنے میں ایک مصلحت یہ بھی سوچی تھی کہ اس طرح "دامن دراز ہوکر طلوع اسلام "تو فوگل" ہے۔ بدریغ" ابھی عہدہ برا ہوسکے گا لیکن ہفتہ وار ہوکر بھی یہی گلہ ہے کہ "داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار"۔ بہرحال ہم کوشش کررہے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ عنوانات کو ہر اشاعت کا معمول بنائیں۔ جو تجویز پیش کی گئی ہے یہ اتفاق ہے پہلے سے ہی طلوع اسلام کے پیش نظر ہے۔ دسمبر اور جنوری کے طلوع اسلام میں جب ہفتہ وار کے عنوانات کا اعلان کیا گیا تھا تو اس میں ایک عنوان "عوام کے لئے" تجویز کیا گیا تھا اور اس کا مقصد یہ بتایا گیا تھا کہ اس کے تحت زندگی کے تمام معاملات کے متعلق قرآن کے احکام بالالتزام پیش کئے جائیں گے اور زبان ایسی عام فہم رکھی جائے گی کہ اس سے بچے بھی فائدہ حاصل کرسکیں گے۔ اس عنوان کی ایک حد تک تلافی باب المراسلات سے ہوجاتی ہے لیکن ہم اس پر اکتفا نہیں کرنا چاہتے۔ انشاءاللہ عنقریب "عوام سے متعلق" ایک مستقل عنوان شروع کردیا جائے گا۔

رسومات کراچی سے ایک صاحب دریافت کرتے ہیں کہ ہمارے یہاں شادی بیاہ وغیرہ تقاریب پر بعض رسومات ہوتی ہیں مثلاً سہرا باندھنا، مہندی لگانا وغیرہ دین میں ان رسومات کی حیثیت کیا ہوگی؟

طلوع اسلام: دین اس قسم کی معاشرتی رسومات سے کوئی تعرض نہیں کرتا جو اس کے کسی اصول سے ٹکرائیں۔ آپ انسانی خلقت پر غور کریں گے تو یہ حقیقت سمجھ میں آجائیگی کہ انسان تمام کا تمام "باشعور" (RATIONAL) نہیں بلکہ اس میں ایک بڑا عنصر غیرشعور (NON- RATIONAL)

کا بھی ہے یعنی وہ عنصر جسے عام طور پر جذبات سے تعبیر کیا جاتا ہے نفسیاتی طور پر اس کی ضرورت ہے کہ انسان کے اس غیر شعوری عنصر کی تسکین کا سامان بھی بہم پہنچایا جائے۔ رسومات انسان کے اس عنصر کی مظہر اور اس کی تسکین کا ذریعہ ہیں۔ اس لئے دین ان چیزوں کو مٹانے کا حکم نہیں دیتا۔ وہ صرف انہیں حدود اللہ کے اندر رکھنا چاہتا ہے تاکہ دریا کا پانی ساحل کو توڑ کر سیلاب نہ بن جائے اور اس طرح اس کی نفع بخشیاں تباہیوں میں نہ بدل جائیں۔ صرف بیاہ شادی کی رسومات ہی نہیں بلکہ قومی تیوہار، ملی تقاریب، فنونِ لطیفہ وغیرہ سب اسی ذیل میں آ جاتے ہیں۔ قرآن کی اپیل فکری ہے اور فکر کی صحیح نشو و نما سے انسان اپنے غیر فکری (NON-RATIONAL) گوشے پر صلح ضبط رکھنا سیکھ جاتا ہے۔ اور اس طرح دین کی عائد کردہ حدود سے وہ نفسیاتی کشمکش میں مبتلا نہیں ہو جاتا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ انسان کی فکری سطح کے بلند ہونے سے یہ غیر فکری عنصر کس حد تک کم ہوتا جائے گا۔ لیکن جب تک یہ عنصر موجود ہے دین اس کی تسکین کے ذرائع کی صرف حد بندی کرتا ہے، اسے مٹاتا نہیں۔ ان امور کی مزید تفصیل اس مضمون میں ملے گی جو "ملی تقاریب" کے عنوان سے "قرآنی فیصلے" نامی کتاب میں شائع ہو چکا ہے۔

کیمبل پور کی "طاہرہ بیٹی" تم نے بڑی خط تو لکھا۔ لیکن اپنا پتہ لکھا ہی نہیں۔

تمہارا
"چاچا جی"
پرویز

حقائق و عبر

(ص ۱۵ سے آگے)

یعنی اس سوا ہزار سالہ لٹریچر سے مودودی صاحب یہ ثابت کرتے ہیں کہ ہماری فکر و نظر کی ساری دنیا پر جاہلیت کے خارجی اثرات چھا گئے اور اسلام کا کوئی تصور بھی خالص طور پر اپنی جگہ باقی نہ رہا۔ اور اب اس لٹریچر سے صدیقی صاحب یہ ثابت کر رہے ہیں کہ جاہلیت کے خارجی اثرات نے ہزار سر مارا لیکن وہ ہمارے فکر و نظر کی دنیا کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے۔

اور دونوں کے دونوں اسلام کے محقق اور جماعت اسلامی کے قائد ہیں۔! اندھوں کی دنیا کی سرداری بھی کس قدر آسان اور دلچسپ ہو گئی ہے!

—— در ین کشمکش اندر!

فروری میں مدر دیسٹرن پاکستان بردر ہڈ نے جنرل اسکندر مرزا کو ایک خطاب پیش کیا۔ یہ جماعت حال ہی میں وجود کوش ہوئی ہے۔ تقریب کا آغاز تلاوت قرآن مجید سے ہوا۔ اس کے بعد قومی ترانہ پڑھا گیا۔ قومی ترانہ پڑھا جانے لگا تو تمام حاضرین کھڑے ہو گئے۔ اس پر ایک مولوی صاحب نے اعتراض کیا کہ تلاوت قرآن کے دوران میں تو کوئی کھڑا نہیں ہوا لیکن قومی ترانے کے لئے سب کھڑے ہو گئے۔ مولوی صاحب کے اس اعتراض پر لوگ بیٹھ گئے۔ جو غیر ملکی نمائندے مدعو تھے انھوں نے ترانے کو بطور احترام کھڑے ہو کر سنا یعنی ایک ہی جلسے میں تلاوت قرآن کے وقت بیٹھے رہے ترانہ کے وقت کھڑے ہو گئے مولوی صاحب نے اعتراض کیا تو بیٹھ گئے .... "نمازِ بے امام" کا یہ واقعہ اس کشمکش کا پتہ دیتا ہے، جس میں اس وقت مسلمان مبتلا ہے۔ وہ ایک طرف بطور تبرک قرآن کی تلاوت کرتا ہے تو دوسری طرف عصر حاضر کی رسم یعنی قومی ترانہ کو بھی ادا کرتا ہے۔ اسے نہ تو یہ معلوم ہے کہ جلسوں میں قرآن کی تلاوت کیوں کرنی چاہیئے اور نہ خبر کہ قومی ترانہ کیوں پڑھنا چاہیئے۔ وہ قرآن پڑھتا ہے تو اس لئے کہ اس نے آباؤ اجداد کو یہی کرتے دیکھا۔ اور قومی ترانہ گاتا ہے تو اس لئے کہ دوسری قومیں ایسا ہی کرتی ہیں۔ مولوی اپنی اجارہ داری کو برقرار رکھنے کی فکر میں ہے اور قوم کو اسی اشک بیچک میں الجھا کر اپنا الو سیدھا کر رہا ہے۔

آوازہ حق آتا ہے کب اور کدھر سے
مسکین و کم مانده درین کشمکش اندر!

پیشگی خریداروں کا گذشتہ حساب

معاونین یا پیشگی خریداروں کی خدمت میں ان کا گوشوارہ حساب دسمبر ۱۹۵۴ء تک کے لئے جنوری ۱۹۵۵ء میں ارسال کیا گیا تھا اور جوابی کارڈ میں حساب کی درستی یا عدم درستی کی اطلاع طلب کی گئی تھی جن اصحاب سے مطلوبہ اطلاع تاحال نہیں بھیجی وہ مہربانی فرما کر ۱۵ مارچ ۱۹۵۵ء تک ضرور بھیج دیں ورنہ اس تاریخ کے بعد فرض کر لیا جائیگا کہ مرسلہ حساب درست ہے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام

اسلام کی سرگذشت

(ص ۲ سے آگے)

تجارتی قافلے

تجار اپنے بڑے بڑے تجارتی قافلے بھیجتے تھے۔ ان قافلوں کو "سترابو" نے دیکھا ہے اور انھیں لشکر سے تشبیہ دی ہے۔ طبری کا بیان ہے کہ ان قافلوں میں سے ایک ایک قافلہ پانچ پانچ سو اور ایک ایک ہزار اونٹوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ ابن ہشام نے غزوۂ بدر کے بارے میں بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے ابوسفیان بن حرب کے متعلق سنا کہ وہ قریش کے ایک بڑے قافلے کو لے کر آ رہا ہے جس میں قریش کے اموال اور تجارتی سامان ہیں اس قافلہ میں خود قریش کے تیس یا چالیس آدمی تھے جن میں مخرمہ بن نوفل اور عمرو بن العاص بھی شامل تھے یہ قافلے بڑی تیاریوں اور عظیم حفاظتوں کے ساتھ نکلتے تھے۔ ان کے آگے آگے ایک دستہ چلتا تھا جسے "کشافہ" کہتے تھے۔ جو راستہ کے متعلق معلومات کرتا جاتا تھا۔ پھر ان قافلوں کے ساتھ راہنما بھی ہوتے تھے جو راستہ بتاتے جاتے تھے۔ ان کے علاوہ مسلح محافظ ہوتے تھے جو قافلوں کی حفاظت کیا کرتے تھے۔

حیرہ کے عرب ایران کے تجارتی قافلوں کی عرب میں حفاظت کے لئے ایک گرانقدر مقررہ رقم پر معاہدہ کرتے تھے۔ جو وہ ایرانیوں سے وصول کرتے تھے مؤرخین کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ایرانیوں نے اس رقم کو زیادہ سمجھتے ہوئے دینے سے انکار کر دیا تو عربوں نے ایرانی قافلے پر حملہ کر دیا۔ اور اس کے محافظ دستوں کو شکست فاش دی۔ یہ ان عرب کے مشہور جنگی ایام میں سے شمار ہوتا ہے جو یوم ذی قار کے نام سے مشہور ہے شعراء نے اس فتح پر گیت گائے اور اسے ایران کے مقابلہ میں عربوں کی فتح شمار کیا۔

شام سے تجارت

جو قافلے ملک عرب سے شام جایا کرتے تھے وہ مقررہ بازاروں میں اترتے تھے جو ان کے لئے رومی حکومت نے متعین کر دیئے تھے۔ تاکہ درآمدات پر مقررہ ٹیکس ان سے وصول کیا جا سکے نیز ان اجنبی لوگوں کی نگرانی کی جا سکے۔ جو ان کے ملک میں آتے تھے۔ یہ قافلے رومی شہروں میں سب سے پہلے ایلہ میں اترتے تھے جو آج کل عقبہ کے نام سے مشہور ہے پھر یہاں سے یہ لوگ غزہ جاتے تھے۔ جہاں یہ لوگ بحر ابیض کے تاجروں سے ملتے تھے۔ پھر غزہ سے کچھ تاجر بصریٰ تک جاتے تھے۔

روایات میں مذکور ہے نبی اکرم صلعم نے بھی ان قافلوں کے ساتھ دو مرتبہ سفر فرمایا تھا۔ ایک مرتبہ جبکہ آپ کی ۱۲ سال کی عمر تھی بصریٰ تک آپ تشریف لے گئے اور دوسری مرتبہ جب کہ آپ کی عمر پچیس سال تھی۔

عالم اسلامی

(صفحہ ۵ سے آگے)

اور جو بھی حکومت بنتی ہے اس کے سامنے بڑا مسئلہ اپنی بقا ہوتا ہے جس کے سامنے مفاد ملکی ثانوی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ اس کا المناک اور عبرتناک پہلو یہ ہے کہ اشتراکی خیالات کو فروغ حاصل ہوتا جا رہا ہے گذشتہ انتخابات میں پہلی مرتبہ ایک اشتراکی رکن کامیاب ہوا ہے۔ عربی دنیا میں یہ پہلا اشتراکی رکن ہے۔ اگر اس کا مداوا نہ کیا گیا تو مشرق وسطی میں یہ خطرہ بڑھ جائے گا۔ لیکن اشتراکیت کے سیلاب کو بھی صرف قرآن ہی کا بند روک سکتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ اس راز کو ابھی تک نہ مشرقی سمجھ سکے ہیں نہ غربی وھم فی طغیانھم یعمھون۔

ان کی مدد کیجئے

سید محمود الحسن صاحب، لعلووالہ، ڈاک خانہ خان پور (ریاست بہاولپور) لکھتے ہیں کہ وہ طلوع اسلام کے مطالعہ کا شوق رکھتے ہیں لیکن خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ ان کی تجویز یہ ہے کہ کوئی صاحب ایک ایک دو دو کتابیں بذریعہ ڈاک ان کی طرف ارسال کر دیا کریں تو وہ مطالعہ کر کے واپس کر دیا کریں گے اور ڈاک کا خرچ ادا کر دیں گے۔ قریب کے قارئین یا بزم ہائے طلوع اسلام کو اس تجویز پر ضرور غور کرنا چاہیئے اور محمود الحسن صاحب کی ضرورت کو پورا کرنا چاہیئے۔

قرانی فکر کی نشر و اشاعت

آپ اس میں کس طرح حصہ لے سکتے ہیں

طلوع اسلام قرانی فکر کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اسکا لٹریچر جسقدر زیادہ شائع ہوگا اسی قدر قرانی فکر عام ہوگی اور اسی نسبت سے قرانی انقلاب قریب سے قریب تر آتا جائیگا۔ اس کے لئے طلوع اسلام نے "پیشگی خریداران" کی اسکیم جاری کی ہے۔ یعنی اگر آپ ایک سو روپیہ پیشگی ادا کردیں (یک مشت یا پچیس روپے کی ماہانہ اقساط میں) تو آپ کا حساب کھول لیا جائیگا اور اس میں سے آپ کو طلوع اسلام کی شائع کردہ کتابیں بلا محصول ڈاک گھر بیٹھے ملتی جائینگی تآنکہ آپ کی پیشگی رقم پوری نہ ہوجائے۔ اس طرح - - -

- آپ کی پیشگی رقم سے ہمیں مزید کتابیں شائع کرنے میں سہولت مل جائیگی۔ اور
- آپ کو طلوع اسلام کی کتابیں بلا محصول ڈاک خود بخود ملتی چلی جائینگی۔ اگر آپ اس وقت تک اس اسکیم میں شامل نہیں ہوئے تو اب شامل ہوجائیے۔

معاملہ کی ضروری باتیں

- طلوع اسلام آپ کا اپنا ادارہ ہے اس لئے اس سے اسی طرح کا برتاؤ کیجئے جس طرح اپنوں سے برتاؤ کیا جاتا ہے۔ یہ بھی آپ سے ایسا ہی برتاؤ کریگا۔
- حساب میں بعض اوقات غلطی ہوسکتی ہے۔ ایسی غلطی باہمی افہام و تفہیم سے صاف کرلیجیے۔
- رسالہ کے انتظامی معاملات کے متعلق الگ خط لکھئے۔ کتابوں کے لئے الگ۔
- مضامین کے متعلق مدیر کے نام علحدہ خط لکھئے۔ نیز استفسارات مدیر کے نام الگ بھیجئے۔
- پتہ کی تبدیلی سے کم از کم دو ہفتہ پہلے اطلاع دیجئے۔
- پرچہ نہ ملنے کی اطلاع تاریخ اشاعت کے ایک ہفتہ کے اندر دیجئے۔ بعد میں رسالہ قیمتاً بھیجا جائیگا۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳۔ کراچی۔ ۳

فردوسِ گم گشتہ

دورِ حاضرہ کے نوجوان طبقے میں جس عقابی روح کی بیداری کے
آثار دکھائی دے رہے ہیں اس کے بال و پر کی بالیدگی میں
مفسرِ قرآن و ترجمانِ اقبال جناب پرویز
کے فکرِ عمیق اور اسلوبِ بلیغ کا حصہ نمایاں ہے
فردوسِ گم گشتہ اسی صاحبِ نظر کے فکر و اسلوب کا دلکش مجموعہ ہے
جو ملت کی متاعِ گم شدہ کی بازیابی کی راہ بتاتا ہے اور جو حساس
قلب ہے جس میں تخلیقِ نو کی آرزو موجزن ہے پکار پکار کر کہتا ہے کہ

صورتگری را از من بیاموز
شاید کہ خود را باز آفرینی

ضخامت ۲۱۲ صفحات مجلد مع گرد پوش قیمت -/۶
علاوہ محصول ڈاک

ناظم ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳ - کراچی - ۳

Title Printed at Mueid Art Press, Thathai Compound, Bunder Road, Karachi Text at Adabi Press, Robson Road, Karachi,
Published by Khurshid Alam from Tolu-e-Islam Office, 23/1, Fowler Lines, Napier Barracks, Karachi. Editor KHURSHID ALAM